

نور شاہ کے تین ناولٹ



مرتبہ
رؤف راحت

meezan
PUBLISHERS

پبلشرز سرینگر کشمیر

نورشاہ کے تین ناولٹ

- آدھی رات کا سورج
- آؤ سو جائیں
- لمحے اور زنجیریں

مرتبہ

رؤف راحت

میزان پبلشرز سرینگر (کشمیر)

- نام کتاب : نورشاہ کے تین ناولٹ
- نوعیت : ناولٹ
- مرتبہ : رؤف راحت
- بار اول : ۲۰۰۹ء
- قیمت : تین سو روپے
- کمپیوٹر کتابت : ایس۔آر۔ایسوسیٹس شالہ ٹینگ سرینگر کشمیر
- مطبع :
- ناشر : میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

Title : Noor Shah Kay Teen Novlet

Edited : Rouf Rahat

Price : 300/=

Publisher : **Meezan Publishers**

Opp. Fire and Emergencey Services
Headquarters, Batamaloo Srinagar,
Kashmir. 190009
Tel: (O) 0194-2470851;
Fax : 0194-2457215
(Mob) 9419002212, 9906677468
Email: Meezanpublishers@rediffmail.com

باھتمام:
شبیر احمد

ترتیب

حرفِ چند

۱۹۵۵ء کے بعد جدیدیت کی آمد آمد تھی ہر نیا قلمکار اس نئے رجحان سے اتنا متاثر تھا کہ کئی لکھنے والے اندھی تقلید کر کے تجریدیت اور علامت کی بھول بھلیوں میں ایسے کھو گئے کہ ان کا کہیں نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس کچھ تخلیق کاروں نے روایتی طرز اختیار کر کے ایسی کہانیاں لکھیں جن کی اساس زندگی کے مختلف النوع تجربات واحساسات پر مبنی تھی۔ انہوں نے کہانی میں کہانی پن کو بحال رکھا، جو اُس دور میں ایک انحرافی اقدام کے مترادف سمجھا جاتا تھا، جب تخلیق کار اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے خول سے نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ قاری کی موت واقع ہوتی اگر نورؔ شاہ جیسے تخلیق کار سامنے نہیں آتے۔

نورؔ شاہ صاحب نے اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو صرف افسانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے باقاعدہ ناول بھی لکھے جن میں ایک ناولٹ شاعر کے ناولٹ نمبر میں بھی شائع ہوا ہے۔ آج تک ان کے چھے افسانوی مجموعے اور تین ناول چھپ کر قارئین ادب سے داد وصول کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ڈائیری اور خاکوں کے حوالے سے دو کتابیں ''بند کمرے کی کھڑکی'' اور ''کہاں گئے یہ لوگ'' بھی تصنیف فرمائی۔ جو ان کی ادب کے ساتھ سچا کمٹ منٹ کو ظاہر کرتی ہیں۔

شاؔہ صاحب نے رومانی اسلوب اپنا کر عصری زندگی کے تقاضوں کو بصورت انداز میں تینوں ناولٹ میں پیش کیا۔ شاہ صاحب اپنے موقف ''زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں'' پر قایم و دائم ہے انہوں نے رومانیت کے پس منظر میں چند گونگے کرداروں کو زبان دینے کی کوشش کی ہے، چند مبہم مبہم سی کہانیوں میں روح پھونکنے کی سعی کی ہے، چند حسین وجمیل اور پُر فریب چہروں سے نقاب سرکانے کی جرأت بھی کی ہے۔ جہاں

تک اردو ادب میں رومانیت کا تعلق ہے تو سجاد حیدر یلدرم نے ابتداء سے ہی شعوری طور پر اس کا آغاز کیا۔ بعد میں اس رجحان کو پروان چڑھانے میں سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری ،مجنون گورکھپوری، جیسے مقتدر افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا۔ اگر دیکھا جائے تو نور شاہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب نے ناولٹ میں شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے اگرچہ ناولٹ کے لئے شاعرانہ اسلوب اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن شاہ صاحب کی تحریروں کی چاشنی اا ور حلاوت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب تخلیق کار ایسا طریقہ کار اختیار کرتا ہے جو قاری پر گراں نہیں گزرتا ہے۔ تو ایسا طرزِ اسلوب اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اعجاز صدیقی شاعر کے ناولٹ نمبر میں ''آؤ سو جائیں'' پر یوں رائے زنی کرتے ہیں:۔

> نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، انداز بیان میں جو شگفتگی، رچاؤ اور موسیقی ہے وہ تو کچھ حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت و جلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہینِ منت، نور شاہ بطور کہانی کار مقبول و معروف ہیں ،نور شاہ کی تحریروں میں شعور و فکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں، زبان و اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے۔
>
> ''آؤ سو جائیں'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے، وہیں ایک یگ کی کہانی بھی ہے۔ اس ناولٹ میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔

نور شاہ ایک جانب لفظوں، رنگوں، موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی لے، وائلن کی دھن اور جسم کے آہنگ کے ذریعہ انتہائی لطیف انداز میں اپنے احساسات کو واضح کرتے ہیں تو دوسری جانب زندگی کی سنگلاخیت کا ذکر بھی اسی شد و مد سے کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کے ناولٹ میں نفسیاتی پیچ و خم کو ایسے پیش کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو کر ایک تخیلی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ کہانی میں انتہائی صورت پیش آنے سے پہلے ہی وہ اختتامی

مکالمے ایسے ادا کرتے ہیں کہ پڑھنے والے میں تجسس بڑھتا ہے۔ اور وہ کشش و پنج میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس بات کی تصدیق علی محمد لون کی اس بات سے ہوتی ہے :۔

> نور شاہ کی اپنی زندگی اس کے چہرے کے خدوخال کی طرح ہموار رہی ہے لیکن اس کی تخلیقات میں بڑے نشیب و فراز ہیں۔ وہ خود شاید جن حالات، ذہنی کیفیات اور انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں سے نہیں گزرا اُن سے اپنے کرداروں کو دوچار کر کے معیاری ادب تخلیق کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں..........!!

اکثر تخلیق کاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے اوب جاتے ہیں یا ہوا دیکھ کر رخ بدلتے ہیں۔ اس کے برعکس نور شاہ پانچ دہائیوں سے مسلسل اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک ہونے کے بجائے ہمیشہ رومان پرور اور معطر ذہنیت سے خود کو سیراب رکھا اور اپنے ہی مسلک و مذہب پر قائم و دائم رہے۔

بہت عرصہ قبل نور شاہ نے تین ناولٹ قلم بند کئے تھے، جن میں ''آؤ سو جائیں'' شاعر ممبئی کے ناولٹ نمبر (1971) میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے ناولٹ ''لمحے اور زنجیریں'' اور ''آدھی رات کا سورج'' قسط وار شائع ہو چکے ہیں، مجھے اپنے کرم فرما عزیز دوست شبیر احمد (ڈائریکٹر میزان پبلشرز) کے کہنے سے یہ تحریک ملی کہ میں نور شاہ صاحب کی تینوں ناولٹ کتابی صورت میں ایک ساتھ پیش کرنے کی سعی کروں۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ کوشش بارآور ثابت ہوگی۔

رؤف راحت
سری نگر کشمیر

یکم اگست ۲۰۰۹

ناولٹ

آدھی رات کا سورج

نور شاہ

انتساب

جُنید گیلانی

کے نام............!!

نورشاہ کی اپنی زندگی اس کے چہرے کے خدوخال کی طرح ہموار رہی ہے لیکن اس کی تخلیقات میں بڑے نشیب وفراز ہیں وہ خود شاید جن حالات ، ذہنی کیفیات اور انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں سے نہیں گذرا اُن سے اپنے کرداروں کو دوچار کر کے میعاری ادب تخلیق کرنے کا تہیہ کیئے ہوئے ہیں..........!!

علی محمد لون

پھول پیاسا تھا!

پھول نے اپنی شاخ کو دیکھا اور ہوا کے جھونکے میں جھوم کر سوچا کتنے سر سبز پتے پھوٹ آئے ہیں آرزوں کے، جنہیں اس نے پہلے محسوس نہیں کیا تھا، دل کی اس کروٹ کے کتنے عنوان تھے جو سلونی نے پہلے محسوس نہیں کئے تھے، اس کی ماں میریا اسے اسکول اور گھر کے کاموں میں اس طرح مصروف رکھتی کہ اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کتنی تصوریں مبہم جذبات کی رنگ بھرے جانے کی منتظر ہیں، لیکن آج کی تنہائی کیسی تنہائی تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ دل سے وہ تہیں اُتار دے جو ماہ وسال کے گزرے ہوئے کارواں نے گرد کی صورت جمادی تھیں۔ آج وہ خود اپنے آپ کو پہچاننا چاہتی تھی۔ اپنے گھر کے درودیوار کو جاننا چاہتی تھی اور اس بند کمرے کو کھولنا چاہتی تھی جو اس نے سن رکھا تھا اس کی آنٹی کا ہے، شاید اپنے دل کی بے نام آرزوؤں کا کوئی سراغ یہاں مل جائے، شاید یہ اس کا وہم تھا، شاید یہ اس کے دل کی آواز تھی کیونکہ اس بند کمرے کو کھولنے کی خواہش کو وہ محض تجسس کا نام دے سکتی تھی!

اس کی ممی باہر تھی، اسکول میں چھٹی تھی اور سلونی تنہا، بند کمرے کی طرف قدم اُٹھائے ہوئے اسے ڈر سا لگا جیسے وہ کوئی چوری کرنے جا رہی ہو، جیسا ایک اَن دیکھا سایہ اُس کا تعاقب کر رہا ہو، صحن میں اس کے قدم رُکے کہ ممی نے بند کمرے کو کھولنے کیلئے منع کر رکھا تھا جیسے وہ بند کمرہ الف لیلوی داستان کا ایک ورق ہو جسے الٹانے کیلئے مجنوں کا جگر چاہیے۔

دل نے کہا...... کسی طرح، جیسے بھی ہو، اس کی جھلک دیکھ لینی چاہیے۔

کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا، اس لئے اس نے سب سے پہلے ممی کے کمرے میں جا کر چابیاں تلاش کیں اور ان میں سے اس نے اندازہ کرلیا کہ کون سی چابی ٹھیک لگ سکتی ہے۔ یہ اندازہ اس کی ایک نگاہ کرگئی کیونکہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کمرے کے تالے کو دیکھنے اور سوچتے رہنے کی عادی بن چکی تھیں پھر چابیاں اپنی ہتھیلی میں چھپائے بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ وہ کمرے کے دروازے تک آئی اور جلدی سے اسے کھول لیا تالے کو آہستہ سے فرش پر رکھ کر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے کی ایک ایک چیز اس کے سامنے تھی، فرش کا قالین، سنگار میز اور وارڈروب، اس قالین پر کتنے عرصے کے بعد کسی کے پاؤں پڑے ہیں۔ یہاں آنٹی سوتی ہوں گی۔ یہاں بیٹھ کر آئینے میں سنگار کرتی ہوں گی، وہ سنگار میز کی طرف بڑھی لیکن آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے رُک گئی اس نے وارڈروب کھولا۔ آنٹی کتنے قیمتی کپڑے پہنا کرتی تھی؟ اس نے اپنی انگلیاں آہستہ سے ان پر رکھ دیں اور اس ریشمی لباس کی ملائمت میں ایک ان جانی لذت کا احساس ہوا اور اسے

محسوس ہوا جیسے دل کے نہاں خانے میں کوئی آرزو مچل اُٹھی ہو اور شاید اسی آرزو کی تکمیل کیلئے کسی اندرونی طاقت کے سہارے، اس نے لباس ہینگر سے اُتار کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا......!

''میں بھی ......!'' خیال آیا اسے پہن کر دیکھ لوں میں اس خوبصورت لباس میں کیسے لگوں گی۔ کس طرح یہ میرے جسم پر سجے گا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور اپنے کپڑے اُتار دیئے۔ پھر آنٹی کے چمکتے ہوئے لباس کو پہن کر اور سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا پر نظر ڈالی!

کیا آئینے میں وہ خود تھی!

کیا وہ اتنی خوبصورت بھی لگ سکتی ہے!!

کیسے اس لباس میں اس کے جسم کا ایک ایک عضو ایک ایک انگ نمایاں ہو سکتا ہے!!

اسے یاد آیا آنٹی ان ہی کپڑوں کو پہن کر اپنے کمرے کو اسی طرح بند کر کے یہیں اسی قالین پر رقص کیا کرتی تھیں اور اس کی ماں کتنی بری طرح ڈانٹا کرتی تھی......تب وہ بالکل چھوٹی تھی، اس کے سوچنے سمجھنے کا شعور نا پختہ تھا، اتنی چھوٹی، اس قدر نا پختہ کہ اسے اپنی آنٹی کی صورت بھی یاد نہ تھی۔ اور گھر میں آنٹی کی کوئی تصویر بھی نہیں لٹک رہی تھی اور جو آنٹی کی تصویریں ......وہ آہستہ سے غنایہ لہجے پر آئی، اس کی شاخ جھک گئی اور نہ جانے کس طرح بے قراری کے عالم میں دوسرے ہی لمحے اس کے پاؤں تھرک اُٹھے۔

اس کے من میں کون فنکار چھپا بیٹھا تھا جو اس کے پاؤں کو اس کے جسم کو تھرکنے کیلئے تحریک بخش رہا تھا ورنہ وہ تو رقص کے الف ب سے ناواقف تھی۔

اس کے ہونٹوں پر یکایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہائے میں رقص کر سکتی ہوں۔ میں بھی ناچ سکتی ہوں۔ میرے پاؤں کی جنبش پازیب کو جھنکار دے سکتی ہے۔ میرے بازوں کی محرابیں زندگی کی ان تصورات پر جھک سکتی ہیں۔ لیکن ماں آجائے گی، ماں آجائے گی۔ کوئی دیکھ لے گا اور پھر............؟

سلونی نے جلدی سے کپڑے اُتار دیئے اور کمرے کو بند کر کے باہر آگئی۔ چابیاں جہاں سے اُٹھائیں وہیں رکھ دیں اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا جیسے سچ مچ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

اور جب ماں آئی تو سلونی نے پوچھا

''ممی آنٹی کہاں ہے؟''

''آنٹی ......'' میریا کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ گیا، ایک ایسا رنگ جو بیک وقت پیار اور نفرت کا اظہار تھا۔

''ہاں ممی آنٹی''، سلونی نے پھر کہا۔

ایک لمحے کیلئے خاموشی چھا گئی۔

سلونی کو محسوس ہوا جیسے یہ خاموشی ممی کو دور بہت دور ماضی کی طرف دھکیل کر لے گئی ہو جہاں اس کے دل کی ہر دھڑکن ایک کہانی ہے اور اس کہانی

کا عنوان ہے...... آنٹی کہاں ہے۔

آنٹی!

صنوبر!!

میری بہن!!!

دوسرے لمحے اس کہانی میں جیسے جان آ گئی اور ممی کی نظروں کے سامنے ایک عورت کا سراپا گھوم گیا...... مستی میں ڈوبی ہوئی دو بڑی بڑی بادامی آنکھیں، بادام کے شگوفوں سے بھی زیادہ خوبصورت چہرے پر بکھرا ہوا زرد زرد رنگ اور اس کے ساتھ جیسے کچھ کچھ سرخ رنگ گھل مل گیا ہو ایسے ہی جیسے خزاں کے شروع شروع میں چنار کے پتوں کا رنگ ہو جاتا ہے۔ موہنی موہنی سی اُبھری اُبھری سی مسکراہٹ جیسے پتھروں کے درمیان میں سے کوئی پیاسا پہاڑی چشمہ چھپتا چھپاتا چلا آ رہا ہو۔ آواز میں نگین جھیل کا سا سکون اور قد...... قد جیسے شالیمار باغ کے سرو بھی شرما جائیں۔

صنوبر...... میری بہن!

پیار نفرت پر غالب آ چکا تھا۔ سلونی نے دیکھا کہ اس کی ممی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

"ممی تم رو کیوں رہی ہو" سلونی نے پوچھا۔

اچانک پیار نفرت کی تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

"میں کہاں رو رہی ہوں،۔ کیوں روؤں، کس کیلئے روؤں ...." ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ممی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس

ہاتھ خود بخود اس کے چہرے کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں اب بھی نہ جانے کتنے قطرے کانپ رہے تھے۔

وہ ماضی سے نکل کر حال میں آ گئی۔

''آؤ سلونی...... دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے۔''

''لیکن ممی''

''کیا ہے؟'' اس نے سختی سے کہا۔

سلونی کی زبان بند ہو گئی۔ اس کا ذہن بھٹک گیا۔ وہ ممی سے بہت ڈرتی تھی کیونکہ اس کی ممی کی طبیعت میں نہ جانے کہاں سے چڑچڑا پن آ گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے بالکل ہمت نہ ہاری، شاید اسے اپنی دل کی کروٹ کا عنوان مل چکا تھا۔

''ممی آنٹی کہاں ہے۔''

ممی کے قدم اندر جاتے جاتے خود بخود رُک گئے اس نے مڑ کر سلونی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے دل میں اُترنے کی کوشش کی۔ اسے ڈر سا لگا۔ اس نے جھرجھری سی محسوس کی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے سلونی کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دی۔

ممی کا سر چکرا گیا۔

آج تک وہ بے خبر کیوں تھی بے حس تھی، اب تک اس نے اس بارے میں سوچا کیوں نہ تھا۔ آخر کیوں نہیں .... وہی مستی میں ڈوبی دو

بڑی بڑی آنکھیں، وہی روپ وہی آواز، وہی تمکنت ...... سلونی ...... صنوبر؟

میریا کو سلونی کی آنکھوں میں وہی تمنائیں، وہی آرزوئیں انگڑائیاں لیتی نظر آئیں جو...... جو آج سے بہت پہلے صنوبر کی آنکھوں میں نظر آتی تھیں۔

اگر صنوبر کی طرح سلونی بھی .... اس نے من ہی من میں سوچا......... "نہیں نہیں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی ہونے نہیں دوں گی۔"

"کیا نہیں ہونے دو گی ممی"

"کچھ بھی نہیں میری بیٹی، کچھ نہیں......"

اس نے سلونی کو اپنے سینے سے لگالیا۔

"آؤ اندر چلیں۔ تمہارے ڈیڈی آتے ہی ہوں گے۔"

"لیکن ممی تم نے کہا نہیں۔ کہ آنٹی صنوبر کہاں ہے۔"

"وہ مرگئی۔" میریا نے چلا کر کہا۔

"ممی"

"ہاں سلونی وہ مرگئی میرے لئے تیرے لئے .... سب کیلئے دیکھ اب صنوبر کا نام میرے سامنے کبھی نہ لینا......"

میریا اندر چلی گئی۔

سلونی خاموش ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ دوبارہ آنٹی کے کمرے میں جا کر روئے...... خوب روئے......!!

دل کی کیسی بے قراری ہے یہ!

سلونی نے سوچا......... ''یہ کیا ہے جو آہستہ آہستہ میرے من میں جاگ رہا ہے۔ کچھ تلخ بھی اور کچھ شیریں بھی...... نہ جانے یہ تلخ تلخ شریں شیریں سادرد مجھے کن اَن دیکھے میدانوں اور پہاڑوں میں سے لے جارہا ہے جو میں نے کبھی نہ دیکھے جن کے بارے میں میں نے کبھی بھی نہ سوچا، ہوا کا یہ کیسا جھونکا میرے دل کے تاروں کو چھو گیا کہ کمرے میں لٹکے ہوئے ان رنگدار پردوں کی ہر سرسراہٹ پر میرے پاؤں تھرکنے لگتے ہیں باورچی خانے سے کسی برتن کے ٹکرانے کی آواز کی کانوں میں سنائی دیتی ہے تو جسم کا ہر حصہ اس آواز کی موسیقی پر جھومنے لگتا ہے میں کیوں چاہتی ہوں کہ ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر وقت آنٹی کا خوبصورت لباس پہن کر رقص کروں ناچوں...... اتنا ناچوں کہ سفیدے کے اونچے اونچے پیڑ، چنار کے یہ سرسبز پتے میرے ساتھ رقص کریں...... سامنے ٹیبل پر پڑی میری یہ کتابیں...... اُف یہ کتابیں ان میں اب دلچسپی نہیں رہی ہے اور...... ''سلونی '' ماں کی آواز تھی جو اپنے کمرے سے بلا رہی تھی سلونی جیسے سپنے سے جاگی...... کس قدر پرکیف سپنا تھا اس نے پھر سوچا...... کاش وہ اسی سپنے میں کھوئی رہتی...... کاش!

''سلونی کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان برف آلود پہاڑوں میں کیا تلاش کر رہی ہو'' اس کی ممی نے کمرے میں آ کر کہا

''ممی...... سپنا۔''

''سپنا......کیا سپنا۔''

''ممی میں ابھی ابھی ایک سپنا دیکھ رہی تھی کہ میں............

ممی نے بات کاٹ دی...... ''ارے لڑکی تمہیں ہو کیا گیا ہے چل اسکول جانے کا وقت ہو گیا تمہارے ڈیڈی تو کب کے چلے گئے۔''

اسکول میں بھی سلونی کا دل نہ لگا، اس نے کتابیں کھولیں تو اسے محسوس ہوا جیسے الفاظ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر ایک ہی بات دہرا رہے ہوں۔

زندگی رقص ہے!

زندگی محبت ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں مل لیں اور سامنے کی طرف دیکھا جہاں اس کے ٹیچر ''موسم بہار کے رقص کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا......

''رقص گانے کی تکمیل سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ارتقا کا اظہار اس قوت سے ہوتا ہے جو ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بجانے سے شروع ہو کر جسم کی حرکتوں تک جا پہنچتا ہے، کبھی آگے کو جھکتے ہوئے اور کبھی پیچھے کی طرف جاتے ہوئے۔ رقاص کے اعضاء اتنی تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کوندر ہی ہے اور جیسے اس میں زندگی کی آگ دہک رہی ہو۔''

سلونی کی نگاہوں میں بے ساختہ وہ منظر گھوم گیا جب اس نے آنٹی کا لباس پہن کر آئینے کے سامنے بیٹھ کر ایسی حرکتیں کی تھیں۔

اسکول سے واپسی پر اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے خدا سے دعا مانگی کہ اس کی ممی گھر پر نہ ہوتا کہ وہ آنٹی کے کمرے میں جا کر دوبارہ اس کا و

قیمتی لباس پہن لے اور آئینے کے سامنے رقص کرے مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا امی اور ڈیڈی چائے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"اے خدایا تو نے میری اتنی سی بات مان لی ہوتی تو تیرا کیا بگڑتا..........."

کئی دن اور کئی راتیں بیت گئیں مگر پھول پیاسا ہی رہا من کی آرزوئیں تشنہ ہی رہ گئیں نہ جانے کتنی بار اس کے قدم آنٹی کے کمرے کی طرف اُٹھے ہر بار اسے پلٹ کر آنا پڑا کمرہ بند تھا اور اس پر لٹکا تالا اس کی تشنگی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

دونوں کے درمیاں دروازہ حائل تھا۔

ایک طرف آنٹی کا خوبصورت لباس اور دوسری جانب اس لباس کو پہننے کی تمنا، ایک طرف قالین کے نقش ونگار اور دوسری طرف پاؤں کو ان پر تھرکنے کی آواز ایک طرف وہ قدآدم آئینہ اور دوسری طرف اس میں ظاہر ہونے کے لئے بے تاب عکس......دروازے کے اُدھر وہ دنیا تھی جو سلونی اپنانا چاہتی تھی اور اِدھر وہ دنیا جس میں اس کے لئے کوئی حسن نہ تھا۔!!

یہ کیسا دروازہ ہے کس قدر مضبوط......!

دروازہ بند ہی رہا سلونی نے کئی بار کھولنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اس کی ممی سارا دن گھر میں ہی رہنا پسند کرتی تھی۔ وہ ممی سے اکثر کہتی رہتی۔

''ممی تم آج کل آنٹی مونیکا کے یہاں کیوں نہیں جاتی۔''

''کیوں کیا ہوا۔'' وہ جواب دیتی

''کچھ بھی نہیں تم بہت دنوں سے نہیں گئی نا اس لئے کہہ رہی ہوں''

لیکن ایک دن اس کی آرزو پوری ہوگئی کسی رشتہ دار کے ہاں سالگرہ کی پارٹی تھی۔ڈیڈی اور ممی چلے گئے سلونی نے سر درد کا بہانہ کر کے جانے سے انکار کیا۔

یہ لمحہ کتنا خوبصورت تھا!

ایک بار دروازہ پھر کھل گیا ایک بار پھر وارڈ روب کھل گیا اور آئینے نے اس لباس کو سلونی کے جسم پر دیکھا۔وہ دیر تک رقص کرتی رہی ناچتی رہی، مسکراتی رہی..........!

لباس اُتار کر اسے دوبارہ وارڈ روب میں رکھا وہ مایوس ہوگئی اس کے ذہن میں ایک نیا خیال اُبھرا...... ''کیا وہ یہ لباس پہن کر اپنی ممی ڈیڈی کے سامنے رقص کرسکی گی۔''

''نہیں نہیں ایسا ناممکن ہے۔'' اس کے دل سے آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ چند ماہ پہلے اسکول میں ایک ناٹک پیش کیا جانے والا تھا۔اسکول کا سالانہ فنکشن تھا سلونی کو بھی اس ناٹک میں کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا.......... سلونی کا ایک رقص میں حصہ لینا تھا یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی مگر جب یہی بات ممی نے سنی تو اس نے خود پرنسپل کے پاس جا کر سلونی کی جانب سے انکار کیا تھا۔اسکول میں ڈانس ٹیچر نے کہا تھا.....

"میڈم سلونی بہت اچھا رقص کر سکتی ہے۔"

"مجھے رقص سے نفرت ہے" ممی نے جواب دیا تھا۔

ٹیچر حیران رہ گیا تھا...... اس روز میں سلونی مایوس ہوگئی تھی۔

اس نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا ایک ایک چیز کو دیکھا ایک ایک چیز کو چوما اچانک ایک بریف کیس میں کاغذ کا ایک پلندہ دیکھا۔ جلدی جلدی دیکھنے لگی اس کی حیرت میں اضافہ ہوا جب اسے ایک ڈائری اور کچھ تصوریں مل گئیں۔ اس نے ڈائری کو چھپا لیا اور تصویریں دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے ایک مدہم سی صورت اُبھری اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنی آنٹی کو پہچان گئی ...... یہ سب صنوبر کی تصویریں تھیں ...... وہ سوچتی رہی اپنے من ہی من میں جانے کیا کرتی رہی اس نے تصوریں دوبارہ بریف کیس میں ڈال دی کمرہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر میں گھس گئی شاید اپنی ممی کو یہ بتانے کے لئے کہ وہ دردسر میں مبتلا ہے......

وقت گذرتا رہا لیکن وہ آنٹی کی ڈائری سکون سے پڑھ نہ سکی یہاں تک کہ اسے چھپانا بھی مشکل ہو رہا تھا......!

اب اسکول کا امتحان پاس کر کے اس کا کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔!

کالج کی اپنی زندگی ہوتی ہے اپنا رنگ روپ اپنا حسن یہاں سلونی کے نئے دوست بنے نئے ماحول میں وہ گھل مل گئی ممی کی نگرانی بھی کسی حد تک کم ہوگئی تھی...... وہ اب صنوبر کی ڈائری پڑھ سکتی تھی۔

۱۱ر مارچ

موسم بہار کے شگوفوں کو میرا سلام!

چناروں کی آگ بجھ چکی ہے چاروں جانب رونق نظر آرہی ہے لگتا ہے زندگی جیسے تمام نگاہوں کے ساتھ گہری نیند سے بیدار ہو چکی ہے۔ جشن بہار منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں بھی ایک محفل رقص میں حصہ لے رہی ہوں حالانکہ ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اپنے کمرے میں کتنی بار رقص کیا ہے۔ اسکول اور کالج کے سٹیج پر بھی کئی بار رقص و موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لیا ہے لیکن وہ اور ہی بات تھی محفل میں سب کے سامنے آؤں گی تو کیا پاؤں بھی اسی انداز سے متحرک ہو سکیں گے۔ سنا ہے سٹیج پر آنے کے بعد فنکار کو ہر دیکھنے والے کے وجود کو بھلا دینا چاہیے۔ میں بھی یہی سوچ لوں گی کہ یہاں میرے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔ جانے کیا ہوگا؟ کیا لوگ میرے رقص کو پسند کریں گے۔ تالیوں کی گونج مجھے کتنا سرشار کرے گی۔ میں اپنے لباس کو آراستہ کرلوں۔ ہر شکن مٹا دوں کہ زندگی کی راہ میرے تصورات کی طرح ملائم اور ریشمی دکھائی دے۔

۲۰ر مارچ

آج میں بہت خوش ہوں میرے سینے کے اندر جو آواز نہ جانے کب سے تکمیل کے لئے انگڑائی لے رہی تھی وہ پوری ہوگئی۔ میں نے محفل رقص میں حصہ لیا۔ میری ہر ادا ہر حرکت پر حاضرین نے داد دی۔ جھوم جھوم اُٹھے اور تو اور مجھے دوسری بار رقص کرنا پڑا۔ کتنی بڑی بات ہے میرا مہمانوں

سے تعارف کرایا گیا۔ حاضرین نے جی کھول کر تالیاں بجائیں۔ مجھے تو اپنی خوش نصیبی پر رشک آ گیا۔ دوسرے فنکار ساتھیوں کیساتھ کافی پی رہی تھی کہ کوئی صاحب ملنے آئے میرے دوسرے ساتھی انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ مجبوراً مجھے بھی اُٹھنا پڑا۔ انہوں نے آتے ہی میرے رقص کی تعریف کی۔ نرملا نے کہا یہ کمل کپور صاحب ہیں۔ ان کے کئی ہوٹل ہیں۔ کہنے لگے۔

''دیوی جی آپ سراپا فنکار ہیں۔ آپ کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہیے''۔

''لیکن کہاں اور کیسے'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا

انہوں نے کہا...... ''میرے ہوٹل حاضر ہیں۔ ہر شام آپ ایک گھنٹہ کا پروگرام دے کر اپنے اندر پوشیدہ فنکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرسکتی ہیں۔'' میری زبان جیسے بند ہوگئی۔

''آپ گھبرایئے نہیں آپ کو معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار ہوں...... سوچیئے اور مجھے جواب دیجیئے''

یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے...... کیا یہ آفر مجھے قبول کر لینی چاہیے؟ کہیں ماریا دیدی اور پاپا............؟؟

ابھی جلدی کیا ہے میں سوچ لوں گی ان کو منا لوں گی اگر میں نے یہ آفر قبول کر لی تو............؟!!

۲۵/ مارچ

کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ مجھے کمل کپور کی آفر قبول کر لینی

چاہیے یا نہیں ...... اُدھر انہوں نے تین چار بار پیغام بھجوائے میریا دیدی اور پاپا کا خوف ہے۔ ان سے بات کرنے کو من تو کرتا ہے لیکن ڈر محسوس ہو رہا ہے! وہ میری بات سن کر شاید ناراض ہوں گے ...... ہاں ناراض تو ہوں گے ہی؟ لیکن میں کیا کروں میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھ رہی ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی آواز میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھر رہی ہو...... صنوبر ایسے موقعے بار بار نہیں آتے ...... تم سراپا فنکار ہو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرو ...... یہ کیسی آواز ہے جو مجھے مجبور کر رہی ہے کیا میرے من میں کوئی فنکار چھپا بیٹھا ہے......!

۲۷/ مارچ

میں نے کمل کپور کے ہوٹل مرنیا میں ہر شام رقص و موسیقی کے پروگرام میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور کپور صاحب کو بھی اس کی اطلاع دے چکی ہوں، میں کل سے باقاعدہ وہاں جا رہی ہوں۔ پاپا اور میریا دیدی کو ابھی کہنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی جان جائیں گے۔ میں انہیں سب بتا دوں گی۔

۲۸/ مارچ

آج پھر ایک بار مجھے یقین ہو گیا کہ میں رقص کر سکتی ہوں، ناچ سکتی ہوں، آج ہوٹل مرنیا بھرا پڑا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں کئی بار اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہاں چائے یا کافی پینے کے لئے آتی رہی ہوں لیکن آج میں یہاں ایک نئے روپ میں آئی، اچھی خاصی تعداد تھی مرد...... عورتیں اور بچے......

آرکسٹرا کی دھنوں پر جب میں نے رقص کرنا شروع کیا تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا میں ناچتی رہی ہوش تو مجھے اس سمے آگیا جب ہال میں بیٹھا ہر فرد تالیاں بجا بجا کر مجھے آفریں کہہ رہا تھا۔ ہر نظر ہر نگاہ مجھ پر تھی۔ جانے لگی تو کپور صاحب نے کہا۔

''صنوبر جی ....آپ نے تو کمال کردیا......''

۳۰/مارچ

میریا دیدی اور پاپا کو پتہ چل گیا ہے کہ میں ہوٹل جاتی ہوں پاپا نے شاید کسی اخبار میں اشتہار دیکھا تھا۔انہوں نے کل رات مجھے خوب ڈانٹا میں خاموش رہی......وہ میرے درد کو نہیں پہچان سکتے!

۱۷/اپریل

ایک طرف ہوٹل کا ماحول یہ لوگ اور دوسرے طرف گھر اور اس گھر میں دیدی......نہ ہوٹل چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی گھر۔اس ماحول سے مجھے پیار ہے کہ اس نے مجھے وہی دیا جس کی میں متلاشی تھی۔ اس ماحول کو میں اب چھوڑ نہیں سکتی......اور گھر کا ماحول...... آج میں جو کچھ بھی ہوں میریا دیدی اور پاپا کی بدولت ہوں۔ وہ مجھے سہارا نہ دیتے تو آج صنوبر کا نام کوئی نہ جانتا۔صنوبر کی ہر حرکت، ہر ادا پر سینکڑوں ہاتھوں میں جنبش نہ ہوتی۔ میریا نے ماں بن کر اور پاپا نے باپ بن کر میری پرورش کی۔ پڑھایا لکھایا رقص کی تعلیم دلائی۔ پاپا کہتے ہیں کہ انہوں نے مجھے رقص کی تعلیم وتربیت اس لئے نہیں دلائی کہ میں ہوٹلوں میں اجنبی نظروں کے سامنے ناچوں......اور میں سوچ

رہی ہوں کہ یہ تو ایک آرٹ ہے فن ہے جسے بند کمرے میں قید نہیں کیا جاسکتا......!!

۲۸/اپریل

مجھے یہاں کام کرتے ہوئے ایک ماہ ہو چکا ہے آج ایک اچھی خاصی رقم بھی مل گئی۔ میں نے یہ رقم میریا دیدی کو دینے کی کوشش کی پاپا بھی تھے۔ انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں اب اپنے پاؤں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔ ان کا بھی سہارا بننا چاہتی ہوں۔

میریا دیدی سلونی کو بھی اب مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہے نہ جانے کیوں؟!

۱/مئی

پریتم کو میں پندرہ دنوں سے یہاں دیکھ رہی ہوں۔ ہر شام آتا ہے اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کافی پیتا ہے۔ ایک بات میں نے نوٹ کی ہے میرا رقص ختم ہونے پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آجاتی ہے۔ وہ میری طرف کچھ ایسے دیکھتا رہتا ہے کہ میری پلکیں خود بخود جھک جاتی ہیں اور نہ جانے کس جذبے کے تحت شرمانے کو جی کرتا ہے۔

۵/مئی

میں نے پریتم کے ساتھ بیٹھ کر کافی پی وہ کس قدر دلچسپ شخص ہے اور کیسی مدھر مدھر باتیں کرتا ہے.....فوج میں کیپٹن ہے۔

۹رمئی

کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ محبت شبنم کے موتیوں سے زیادہ نازک ہوتی ہے اور جب یہ دل کے پھول پر گرتی ہے تو سارے وجود میں ایک اَن دیکھی سی کیفیت چھا جاتی ہے...... میرے لئے پریتم نے کوئی ایسا ہی روپ تو نہیں اپنا لیا ہے؟ میں اسے چاہنے تو نہیں لگی ہوں...... نہیں تو؟! لیکن .... پھر اس کیفیت کو کیا نام دوں؟!

۱۵رمئی

پریتم...... پریتم، ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر پل اس کی صورت نظروں کے سامنے رہتی ہے اس کی میٹھی میٹھی باتیں دل کو لبھاتی ہیں وہ جب بھی میری تعریفیں کرنے لگتا ہے تو میں شرما جاتی ہوں......!

اس کے بعد ڈائری کے کچھ اوراق ضائع ہو چکے ہیں یا ضائع کئے جا چکے ہیں......!!

۱۲راگست

پریتم اور میں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے میر یا دیدی اور پاپا اس شادی سے ناخوش ہیں......

لیکن میں پریتم کے بغیر رہ نہیں سکتی کیونکہ میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں میں اپنے اندر کے فنکار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلا سکتی ہوں اپنے فن کا گلا گھونٹ سکتی ہوں مگر پریتم کے بغیر رہ نہیں سکتی...... پریتم کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اور ہم دونوں یہاں سے جا رہے ہیں...... پاپا...... میریا

دیدی ...... سلونی ...... سب کو چھوڑ کر جا رہی ہوں میرے خدا مجھے یہ کیا ہو گیا ہے......!

۳۰ راگست

یہ رات اس کمرے میں میری آخری رات ہے کیسی عجیب رات ہے یہ رات اپنے ساتھ خوشی لائی ہے اور غم بھی ...... دکھ سکھ ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہے ہیں پر تیم کو ہمیشہ کے لئے پانے کا خیال اور میرا دیدی اپنی بہن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جانے کا ڈر ...... اس شفقت کو چھوڑ دوں جو مجھے میری بہن سے ملا پر تیم کو چھوڑ دوں جو مجھ سے والہانہ پیار کرتا ہے......؟

(آگے کی تحریر صاف پڑھی نہیں جاتی ...... سلونی مشکل سے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے)

میرا قلم کانپ رہا ہے انڈین ایرلائنز سے سیٹ بک ...... نیلا آسمان ...... اوپر ہی اوپر ...... خاندانی عزت ...... سلونی کا خیال رکھنا دیدی ...... آخری سلام میری پیاری بہن......؟!!

کالج کی فضاؤں نے سلونی کے خیالات میں ایک نیا رنگ بھر دیا اس نے موسیقی اور رقص کو ایک مضمون کی حیثیت سے لے لیا اور اپنی تمام تر توجہ اسی طرف دینے لگی اپنی فرصت کا ہر لمحہ اس نے رقص اور موسیقی کے کمرے میں گزارنا شروع کیا۔ میوزک ٹیچر نے جب سلونی میں ان چیزوں کے لئے اتنی دلچسپی دیکھ لی تو وہ سلونی پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ نئی نئی باتیں بتاتا رہا، سکھاتا رہا سلونی بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی اور ان پر عمل کرتی۔ اکثر میوزک

پیریڈ میں میوزک ٹیچر ہارمونیم بجاتا اور سلونی اس کی تان پر تھرک اُٹھتی۔ سوز وساز میں جب اس کے جسم کی لرزش اور تھرتھراہٹ شامل ہوجاتی تو ان کا ملاپ اس قدر خوبصورت ہوجاتا کبھی کبھار کوئی گیت بھی اس کے نرم نرم ہونٹوں پر تھرکنے لگتا......اب اسے آنٹی کے کمرے میں جانے کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی۔ جب کبھی دل یا ذہن کے کسی گوشے سے آنٹی صنوبر کی تصویر اُبھرتی محسوس ہوتی تو فوراً اس کی ڈائری نکال کر پڑھنا شروع کرتی اور خوب روتی، صنوبر کے لئے صنوبر کے اَن دیکھے پیار کے لئے......!!

وہ من ہی من میں سوچتی۔ ''ممی آنٹی صنوبر کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کرتی ہے۔ ڈیڈی نے بھی خاموشی اختیار کی ہے...... کیا ان کے دل میں صنوبر کے لئے ذرا بھی شفقت نہیں......'' یہ سوچتے سوچتے اس کے من میں نفرت کا ایک جذبہ اُمڈ آتا۔ اپنے ڈیڈی کے لئے۔ اپنی ممی کے لئے اپنے ماحول کے لئے جہاں فن کی کوئی قدر نہیں۔ جہاں فن کو پرکھنے والی نگاہ نہیں۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے...... ''کاش کوئی ان آنسوؤں کی قدر کرتا کوئی ان آنسوؤں کی کہانی سنتا......''!!

اور کبھی کبھار اسے آنٹی صنوبر کے لئے بھی نفرت کا ایک ہلکا سا احساس ہوتا۔ وہ سوچتی اس نے کیوں پریتم کو اپنا لیا۔ کیوں اپنے اندر کے فنکار کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔ عجب شئے ہے یہ محبت۔ آنٹی کو رقص سے محبت تھی۔ موسیقی سے لگاؤ تھا تو...... کسی اور سے محبت کیوں کی...... پریتم سے پیار کیوں کیا......!

وقت کا پہیہ گھومتا رہا!

کالج کے ہر لڑکے اور لڑکی کی زبان پر اب سلونی کا نام تھا۔ کالج میں جب بھی رقص یا موسیقی کا کوئی پروگرام ہوتا کوئی فنکشن ہوتا سلونی کا نام اس میں پیش پیش ہوتا۔ کچھ شرارتی لڑکوں نے اسے کالج کی رقاصہ کا نام دے رکھا تھا۔

ادھر ماریا ان سب باتوں سے بے خبر تھی وہ سمجھتی تھی کہ لڑکی کالج میں پڑھتی ہے اس لئے اس کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں زیادہ پختگی آئی ہے وہ خود اپنا برا بھلا سوچ اور سمجھ سکتی ہے اس لئے سلونی کی زندگی میں اب اس کا زیادہ دخل نہ تھا۔ خاص طور پر کالج کی زندگی کا۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ نہ تھا کہ سلونی اپنی آنٹی کے نقش وقدم کو اپنا رہی ہے۔!

سلونی کے ڈیڈی اور ممی چند دنوں کے لئے باہر گئے تھے لیکن یہ چند دن سلونی کی زندگی میں ایک نیا پیغام ایک نیا ولولہ ایک نیا حسن لے کر آ گئے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ دونوں وقت کا کھانا آنٹی مونیکا کے گھر سے آتا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ آنٹی کے کمرے میں جاتی، ہر شام آنٹی کے کمرے کا دروازہ کھلتا وارڈروب میں لٹکا آنٹی کا خوبصورت لباس سلونی کے تن پر سجنے سنورنے لگتا...... وہ معمول کی ایک شام تھی، سلونی آنٹی صنوبر کے کمرے میں اس کا قیمتی لباس زیب تن کئے باہر کی دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ آنٹی مونیکا چلی آئی اور سلونی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے پاؤں ساکت ہو گئے جیسے اس کے جسم میں جان نہ ہو بلکہ وہ پتھر کی ایک مورتی

ہو خاموش بے حس مورتی ......!

سلونی نے اسے دیکھا ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گئی اسکے چہرے کا رنگ بگڑ گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''آؤ......آؤ آنٹی مونیکا''

مونیکا جیسے کسی گہرے سپنے سے جاگ اُٹھی!

وہ اندر آئی ...... سلونی کے قریب اور قریب اس نے سلونی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

آنٹی مونیکا''سلونی نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا''

''میرے طرف دیکھ...... میری طرف''

''کیا ہے آنٹی''

وہی آنکھیں وہی چہرہ وہی بال وہی رنگ وروپ وہی لباس سب کچھ وہی ......سب کچھ صنوبر جیسا''

''آنٹی......آنٹی میں سلونی ہوں......صنوبر نہیں''

''ہاں جانتی ہوں کہ تم صنوبر نہیں سلونی ہو لیکن نام میں کیا رکھا ہے۔ بیٹی سلونی''

آنٹی مونیکا روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ یہ لمحہ کیسا تھا جس نے سلونی کو صنوبر کا روپ دیا تھا سلونی کی آنکھوں میں یہ کیسا پیغام تھا جس نے آنٹی مونیکا کو رونے پر مجبور کیا یہ کیسی دھڑکن تھی جو رفتہ رفتہ اس کے دل اور ذہن پر ایک نقش بنا رہی تھی۔

رات کے کھانے پر سلونی نے آنٹی مونیکا کے ساتھ صنوبر کا ذکر چھیڑا۔ سلونی نے کتنی ہی باتیں کہیں لیکن مونیکا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے مونیکا کو دیکھے جا رہی تھی۔

اچانک جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا سلونی نے کہا

"کاش آنٹی صنوبر زندہ ہوتی"

"کون کہتا ہے کہ صنوبر مر چکی ہے وہ زندہ ہے اور......"

سلونی نے اس کی بات کاٹ دی......" کیا میری آنٹی زندہ ہے۔

"ہاں"

"لیکن ممی"

"تمہاری ممی جھوٹ کہتی ہے تمہاری آنٹی ممبئی میں ہے اور اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہے ان کے دو بچے بھی ہیں۔"

"لیکن آنٹی مونیکا تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے"

"میں سب جانتی ہوں سب کچھ......تمہاری ممی بھی جانتی ہے تمہارا ڈیڈی بھی واقف ہے......"

سلونی ایک ہی سانس میں صنوبر کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

"اب بھی اس کے خط تمہاری ممی کے نام آتے ہیں میں نے خود خط پڑھے ہیں تمہاری ممی اپنی بہن سے شدید نفرت کرتی ہے وہ اس کا منہ تک دیکھنا نہیں چاہتی۔"

''میرا بس چلے تو میں......'' اس کے آگے سلونی کچھ بھی نہ بول سکی اور اس کا گلا بھر آیا اور روتے روتے کہا۔

''آنٹی مونیکا مجھے صنوبر کا ایڈرس بتادو میں اسے خط لکھوں گی اسے اپنے پاس بلاؤں گی وہ نہیں آئے گی تو خود چلی جاؤں گی......آنٹی......پلیز آنٹی''

مونیکا خاموش ہوگئی

''تم جانتی ہو کہ میں آنٹی سے کس قدر پیار کرتی ہوں''

مونیکا چونک پڑی......'سلونی میری بات سنو''

''تم اس کا ایڈرس نہیں بتاؤ گی تو میں خود اس کی تلاش میں ممبئی جاؤں گی''

''میری بات سنو''

''میں اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتی......میری آنٹی زندہ ہے۔''

''میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ تمہاری آنٹی زندہ ہے صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ تم اسے کس قدر محبت کرتی ہو......تمہاری آنکھیں تمہارے بال تمہارا چہرہ اور رنگ ولباس دیکھ کر اچانک صنوبر کی صورت میری نظروں کے سامنے پھر گئی اور میں نے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔

''تم نے بھی میری ماں کی طرح جھوٹ بولنا شروع کردیا ہے......میری آنٹی صنوبر زندہ ہے میں اس کے پاس جاؤں گی اس کے سامنے رقص کروں گی اور بتاؤں گی کہ اس نے میرے روپ میں ایک بار پھر

جنم لیا ہے"

مونیکا سٹپٹا گئی، لیکن وہ مجبور تھی بات اس کے منہ سے نکل چکی تھی۔

"میرے پاس تمہاری آنٹی کا ایڈرس نہیں البتہ تمہاری ممی یا ڈیڈی کے پاس ضرور اس کا کوئی نہ کوئی خط ہوگا...... میں نے کہا کہ کبھی کبھار اس کے لیٹر آتے رہتے ہیں وہ خط تلاش کرو...... شاید صنوبر کا ایڈرس مل جائے۔"

اس رات سلونی نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز دیکھ ڈالی مگر اسے صنوبر کا کوئی خط نہ ملا اس رات وہ سو نہ سکی............!!

اس روز کالج کی سالانہ تقریب تھی۔ شہر کے ذی عزت اور صاحب اقتدار لوگوں کے علاوہ طلباء اور طالبات کے والدین کو بھی مدعو کیا گیا تھا سالانہ تقریب کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے، باہر کے گیٹ سے لے کر کالج کی بلڈنگ کو خوب سجایا گیا تھا۔ ہر طرف پھولوں کے رنگ برنگی گیٹ بنے تھے۔ رات کے اندھیرے میں بجلی کے رنگ برنگے قمقمے جھلملا رہے تھے۔ پھول ہنس رہے تھے اور زندگی مسکرا رہی تھی دوسرے والدین کے ساتھ ساتھ سلونی کی ممی اور ڈیڈی بھی ہال میں موجود تھے۔

پروگرام کا آغاز پرنسپل کے ایڈرس سے ہوا۔ انہوں نے کالج کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ایک ڈرامہ کھیلا گیا۔ ایک محفل رقص وموسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ جب سٹیج سکریٹری نے مس سلونی کا نام لیا تو ایک لمحے کے لئے جیسے سلونی کی ممی کی دل کی دھڑکنیں بند ہو گئیں۔ اس کا بس چلتا تو سارے ہال کو آگ لگا دیتی، ہاں آگ جو اس کے من میں لگ چکی

تھی اور جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سٹیج سکرٹیری نے ابھی ابھی اعلان کیا تھا......

''حاضرین اب کالج کی سکنڈ ائیر طالبہ مس سلونی آپ کے سامنے رقص پیش کر رہی ہیں۔

مس سلونی

اس کے بعد سٹیج سکرٹیری نے کیا کہا۔ ممی نے کچھ بھی نہ سنا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں۔ اسی دوران ہال کی روشنی گل ہوگئی، پردہ اُٹھ گیا، رنگ برنگی روشنی کے درمیان سلونی نے اپنا رقص شروع کیا......

لگ رہا تھا جیسے سٹیج پر کنول کا پھول کھل اُٹھا ہو اور مسکرا رہا ہو......اور ممی اس سوچ میں پڑ گئی کہ یہ سلونی ہے یا صنوبر، سلونی نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ صنوبر کے لباس سے مختلف نہ تھا۔

ساز بجتے رہے۔ شاخ جھکتی رہی۔ پاؤں تھرکتے رہے، بازو لہراتے رہے اور رقص ہوتا رہا......!

سلونی کی ہر ادا، ہر حرکت پر حاضرین کی تالیوں سے ہال گونجتا رہا۔

اس کے بعد انعامات کی تقسیم تھی، ممی سے یہ منظر نہ دیکھا گیا، وہ اس آگ پر قابو نہ پاسکی جو اس کے من اور تن کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔

گھر آتے ہی وہ سب سے پہلے صنوبر کے کمرے میں گئی۔ اندر قدم رکھتے ہی اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی آج وہ اتنی مدت کے بعد اس کمرے میں داخل ہوئی تھی اس کمرے کی ایک ایک چیز اسے بھولی بسری

کہانی یاد دلا رہی تھی۔ جس کا ہر نقش ہر خیال وہ اپنے ذہن سے مٹا چکی تھی لیکن اب اس کمرے میں آ کر وہ کہانی ایک بار پھر زندہ ہو گئی تھی۔ اس کہانی کا ہر نقش قالین کے نقش و نگار کے روپ میں مسکرا رہا تھا، ہر خیال قد آدم آئینے میں جگمگا رہا تھا۔ میریا نے اپنے آپ کو سنبھالا اور لرزتے ہاتھوں سے وارڈ روب کا دروازہ کھولا سب چیزیں ایسی ہی تھیں جیسے صنوبر چھوڑ کر چلی گئی تھی مگر صنوبر کا وہ لباس غائب تھا جو وہ اکثر رقص کرتے وقت استعمال میں لاتی تھی۔

وہ باہر آ کر سلونی کا انتظار کرنے لگی۔

سلونی کافی دیر سے گھر لوٹ آئی!

''سلونی'' میریا نے چلاتے ہوئے کہا

''کیا ہے ممی!

''تم نے کس کی اجازت سے رقص کی محفل میں حصہ لیا''۔

سلونی نے کوئی جواب نہ دیا، ایک ہاتھ ہوا میں لہرایا اور سلونی کے نرم و نازک گال پر ایک نشان پڑ گیا۔

سلونی پھر بھی خاموش رہی۔

''تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی''

''ممی''، سلونی نے کہا..... ''تم اس سوال کا جواب اپنے من سے بھی پوچھ سکتی ہو۔''

اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ہاتھ ہوا میں ایک بار پھر لہرایا اور لہراتا ہی رہا ''ممی''، سلونی نے کہا ''تم اپنے من سے اپنے آپ سے اس سوال کا جواب

نہیں پوچھ سکتی کیونکہ تمہارے دل میں نفرت ہے اپنی بہن کے لئے اور جس کا انتقام اب تم مجھ سے لینا چاہتی ہو۔ رقص کرنا کوئی گناہ نہیں یہ تو آرٹ ہے اور اسے دیکھنے کے لئے آنکھ چاہیے۔ سمجھنے کے لئے شعور چاہیے جو تم میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو تم اپنی زندگی میں اس بہن کو گھر سے بے گھر نہ کرتی جس کی تم نے ماں بن کر پرورش کی...... تم کہتی تھی کہ آنٹی صنوبر مر چکی ہے لیکن آج ہی ممی تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میری آنٹی اور آپ کی بہن زندہ ہے۔ ممبئی میں رہتی ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا۔''

''ممی تم میری آنکھوں میں جھانکو، اپنے دل میں ڈوب کر بتا دو کیا آنٹی صنوبر زندہ نہیں ہے۔''

''وہ میرے لئے مر چکی ہے۔''

''لیکن میرے لئے نہیں میں نے آنٹی صنوبر کے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا ہے، اُس کمرے کی درو دیواروں نے کئی بار میرے گھنگروؤں کی آواز کو اپنے اندر چھپا لیا ہے اور...... میں نے خود آنٹی کی ڈائری کو پڑھا ہے، ایک بار نہیں کئی بار سینکڑوں بار، اس ڈائری کا ایک ایک لفظ میرے دل کی کتاب پر لکھا ہوا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔''

کمرے میں سلونی کے ڈیڈی بھی آ گئے اور وہ اپنی بیوی کو کمرے سے باہر لے گیا۔

ممی کے جانے کے بعد سلونی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کے جہلم میں

جو سیلاب آ گیا تھا وہ اب اُتر چکا ہے، شانت ہو گیا ہے۔

اندر کمرے میں ڈیڈی اپنی بیوی میریا سے کہہ رہا تھا۔

''لڑکی بالغ ہو چکی ہے اور بالغ لڑکی پر ہاتھ اُٹھانا زیب نہیں دیتا۔''

چند دنوں کے بعد سلونی کا کالج جانا بند کر دیا گیا۔ صنوبر کے کمرے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا اسی دوران سلونی کو صنوبر کا ایک خط ملا گو کہ یہ خط بہت پرانا تھا لیکن خط کے ایک حصے میں صنوبر کا ایڈرس صاف صاف لکھا تھا......!

سلونی نے یہ خط چھپا لیا......!!

سلونی کئی راتیں سو نہ سکی۔ وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو چکی تھی۔ دل پر بوجھ تھا اور نگاہوں کے سامنے مختلف تصویریں ابھر رہی تھیں ایک طرف پاپا اور ممی دوسری طرف آنٹی صنوبر اور اندر چھپا فنکار...... کئی دن اور کئی راتیں وہ زندگی کے ایک ترازو سے دوسرے ترازو میں لٹکتی رہی اور پھر ایک دن اس نے ایک فیصلہ کر لیا......اس فیصلے پر وہ اداس ہوئی اور خوش بھی۔ اس کی آنکھوں نے آنسو بھی بہائے اور لبوں نے مسکراہٹ کے پھول بھی بکھیر دیئے......!

سلونی نے اپنی ممی کو ایک خط لکھا۔

ممی!

یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری خط ہے جو میں تمہیں لکھ رہی ہوں آج یہ خط لکھتے ہوئے میں اُداس بھی ہوں اور خوش بھی۔ اداس اس لئے کہ

میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں اور خوش اس لئے کہ میں اپنی آنٹی کو پانے کے لئے جا رہی ہوں میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے کتنے ارمان ہوں گے، تم نے کتنی بار سپنوں میں مجھے دلہن بنتے دیکھا ہوگا تم نے کتنی بار، ڈھولک پر بابل کے گیت سنے ہوں گے، کتنی بار تمہارے گھر کے دروازے پر شہنائیاں بجی ہوں گی نہ جانے کتنی بار تم نے نیند میں میرے ہاتھوں کو چوما ہوگا۔ جانتی ہوں کہ تم نے صنوبر کیلئے بھی ایسے ہی سپنے دیکھے ہوں گے۔ ایسے ہی سوچا ہوگا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ممی لیکن صنوبر کی دنیا وہ نہ تھی جو تم نے سپنے میں دیکھی تھی، یا جس کا تصور تم نے جاگتے میں کیا تھا۔ صنوبر کی دنیا میں فن اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا وہی میری دنیا بھی ہے۔ ہماری اس دنیا سے تمہیں نفرت ہے، مجھے جس روشنی کی تلاش ہے وہ تمہاری دنیا میں میسر نہیں!

میں صنوبر آنٹی کے پاس جا رہی ہوں، میں جان گئی ہوں کہ وہ کہاں ہے کہاں رہتی ہے اس لئے میرے لئے فکر مند نہ ہونا۔ ہو سکے تو میری غلطیوں کو معاف کرنا، ڈیڈی کا خیال رکھنا اور اپنا بھی!

اچھا ممی میں جا رہی ہوں اپنی منزل پانے کیلئے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کیلئے یسوع مسیح سے میرے لئے دعا مانگنا، میری اپنی ممی......!!

سلونی

میریا کو جب سلونی کا یہ خط ملا تو وہ کب کی جا چکی تھی۔

میریا کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی......ایک بھیانک اور طویل تاریکی......!!

نیا شہر نئے لوگ، نیا ماحول...... سلونی کی خوابوں کی دنیا ممبئی!

ٹرین سے اُترتے ہی سلونی کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے، تنہا ہے اور زندگی کا طویل سفر اب شروع ہو رہا ہے۔ اسے دور بہت دور جانا ہے اُسے آنٹی صنوبر یاد آئی اور بے ساختہ اس کا ہاتھ اس جیب کی طرف بڑھ گیا جہاں صنوبر کا ایڈرس موجود تھا۔

''میم صاحب'' ''آپ کا سامان''

وہ چونک پڑی۔

''یہ اٹیچی''

سٹیشن سے باہر آئی۔ باہر آ کر اس کی نظروں کے سامنے واقعی ایک نیا شہر تھا۔ ایک ہی لمحے میں کتنے لوگ، کتنے چہرے سب کے سب اجنبی۔

''میم صاحب ہوٹل''

''میم صاحب کدھر جانا مانگتا''

''میم صاحب ہمارا ہوٹل اچھا ہے اور سستا بھی''

''میم صاحب تاج لے چلوں آپ کو''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، اس کے پاس جواب دینے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں، وہ اپنی آنٹی سے ملنے آئی تھی ایک نئی دنیا بسانے کیلئے ایک نئے خواب کی تعبیر کی تلاش میں!

''ٹیکسی''

ٹیکسی آئی اور قلی نے سامان رکھا، وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی......لگتا ہے سالی ممبئ ایکٹرس بننے کے لئے آئی ہے''۔

''پر بل تو دیکھو۔ چار دنوں میں پتہ چل جائے گا۔'' کسی نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک موٹی سی گالی دی جو سلونی نے پہلی بار زندگی میں سنی تھی۔ اس کا جی کر رہا ہے کہ اس لفنگے کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مار دے اور..........!

''کہاں چلنا ہے میم صاحب: اس کے خیالات کا رخ بدل گیا۔

''کھار''

''کون سی سڑک''

''بارویں''

ٹیکسی خراٹے بھرتی رہی، سلونی اُدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ بڑے بڑے مکان اونچے اونچے مکان بڑی بڑی دکانیں۔ مشینوں کی طرح چلتے پھرتے لوگ ایک دوسرے سے بے خبر اپنی دنیا میں گم......!

ٹیکسی رک گئی۔

سلونی کا ہاتھ ایک بار پھر جیب کی طرف بڑھ گیا، اس نے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اسے پڑھنے لگی......!

کیپٹن پرتیم پال

شانتی نواس ۱۲/ویں سڑک، کھار ممبئ ۵۲۔

''ذرا دیکھو تو شانتی نواس کہاں ہے۔''

ڈرائیور دیکھنے چلا گیا تو سلونی کے من میں خیال آیا......"مجھے آنٹی کو پہلے لیٹر لکھ لینا چاہیے تھا تا کہ وہ میرا انتظار کرتی کیا وہ مجھے پہچان سکے گی۔ ارے کیوں نہیں سب ہی تو کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی صورت ملتی ہے وہ مجھے دیکھے گی تو کس قدر خوش ہوگی اس کے بچے اور کیپٹن صاحب......!

"میم صاحب شانتی نواس سامنے ہے"

ٹیکسی سے سامان اُترا اور قلی نے اسے شانتی نواس تک پہنچا دیا۔ سلونی نے اپنے مختصر سے سامان کو لان میں رکھا اور اوپر جا کر اپنی آنٹی کا پتہ کرنے گئی۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ تک، ایک چہرے سے دوسرے چہرے تک کوئی بھی کیپٹن پرتیم پال کو جانتا نہ تھا سلونی گھبرا گئی۔

"کیا یہ شانتی نواس نہیں ہے۔"

جواب ملتا ہے شانتی نواس تو یہی ہے۔

"کیپٹن پرتیم پال اس کی بیوی صنوبر اور دو بچے"

گردن نفی میں ہل جاتی۔

شانتی کہیں نہ تھی صرف نواس رہا گیا تھا۔

"یہ کیسے لوگ ہیں جو ایک ہی بلڈنگ میں رہتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کو نہیں جانتے، ایک بلڈنگ، ایک مکان ایک گھر، ایک خاندان لیکن ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں کوئی سمبندھ نہیں......"

سلونی جس سہارے یہاں آئی تھی وہ سہارا چھوٹ گیا تھا جو سفر اس نے امنگوں اور حوصلوں سے شروع کیا تھا وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی محرومیوں اور مایوسیوں میں بدل گیا تھا۔ زندگی کو روشن دیکھنے کی جو تمنا اس کے دل میں ابھر آئی تھی وہ دھیرے دھیرے تاریکی میں گم ہوگئی تھی اس نے اپنی آنٹی کے سہارے اپنے فن کے سہارے کائنات کو حسین بنانے کو جو خواب دیکھا تھا وہ خواب وہ سپنا آنکھ کھلنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا......!

وہ مایوس ہو کر پھر لان میں لوٹ آئی اس کا ہاتھ ایک بار پھر جیب کی طرف بڑھ گیا چھوٹے سے کاغذ پر لکھا ہوا ایڈرس اب بھی موجود تھا اور مسکرا مسکرا کر اس کا مذاق اُڑا رہا تھا...... اس نے ایڈرس کو جیب میں رکھا اور اس کا ہاتھ ان چکنے چکنے نوٹوں سے ٹکرا گیا جو اس نے بچپن سے لے کر اب تک سنبھال کر جمع کئے تھے۔

اب یہی چند نوٹ اس کا سہارا تھے۔ کاغذ کے یہی رنگدار پرزے اس کی کائنات تھے۔

سامان پھر ٹیکسی میں رکھا گیا

"کہاں لے چلوں میم صاحب"

"کوئی اچھا اور سستا ہوٹل"

ٹیکسی پھر ان ہی سڑکوں پر دوڑنے لگی جن پر ابھی چند لمحے پہلے سلونی نے ایک اُمنگ، ایک خواہش لے کر سفر شروع کیا تھا اس لمحے وہ سڑک کتنی خوبصورت تھی کہ وہ سلونی کو اپنی آنٹی سے ملانے جا رہی تھی سڑک وہی

تھی لیکن کس قدر بدصورت کہ آنٹی ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گئی تھی۔

ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا، چھوٹے سے کمرے تھے اور شاید چھوٹے سے لوگ بھی تھے ایک چھوٹے سے کمرے میں سلونی نے اپنا اٹیچی رکھا اسے کھولا منہ ہاتھ دھویا اور چائے پی۔

شام کے طویل سائے رات کی تاریکیوں میں بدل گئے۔

سلونی سو نہ سکی۔ نیند جیسے آنٹی صنوبر کی طرح دور دور چلی گئی تھی۔

دل سے آواز آئی...... ''واپس جاؤ...... واپس جاؤ...... یہ ممبئی ہے۔

یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے نہیں پہنچانتے...... تمہیں کیا پہنچانیں گے۔

ذہن نے سرگوشی کی۔

''تم آنٹی سے ملنے آئی تھی اپنے فن کو جلا بخشنے کے لئے آنٹی نہ ملی تو کیا ہوا؟ فن تمہارے پاس ہے آرٹ تمہارے پاؤں کی تھرک میں پوشیدہ ہے اگر تم میں ہمت ہے تو یہ لوگ خود ایک دن تمہیں پہنچاننے کے لئے مجبور ہوں گے۔''

دل سے پھر آواز آئی۔

''تنہا ہو، خوبصورت ہو، جوان ہو، مردوں کی نگاہیں فوراً تمہاری خوبصورتی اور جوانی کو پہچان سکتی ہیں۔ اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ۔''

''کہاں''

''اپنے گھر''

"گھر......کون سا گھر کس کا گھر جو میرا گھر تھا وہ اب میرے لئے اجنبی بن چکا ہے اس گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں ایسے ہی جیسے صنوبر کیلئے ہوئے تھے......"

"تو میں کیا کروں" سلونی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی اور ایک بار پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے لیکن تب بھی تو ہو تنہا تھی جب ہوا کے ایک جھونکے سے آرزوؤں کے کتنے سرسبز پتے پھوٹ آئے تھے، دل کی کہانی کو عنوان مل گیا تھا۔ تب اور اب میں فرق ہے...... پھول پیاسا ہے۔

دوسری صبح وہ پھر شانتی نواس گئی۔ ایک بار اور اس سڑک نے اس کے قدموں کی آہٹ کو چوما۔

شانتی نواس ایسے ہی کھڑا تھا...... وہی کمرے...... وہی لوگ...... وہی چہرے لیکن کیپٹن پرتیم پال کا کوئی کمرہ نہ تھا کوئی گھر نہ تھا، ایک بوڑھیا جن کے چہرے کے کھنڈر اس کے بنگالی ہونے کی نمائندگی کر رہے تھے سلونی کی پریشانی اور گھبراہٹ کو سمجھ گئی۔

"بیٹا تم کس کیپٹن پرتیم پال کو ملنا مانگتا۔"

اب وہ کیا جواب دیتی کہ وہ کس کیپٹن پرتیم پال کو ملنا چاہتی ہے اس نے پرتیم کو دیکھا ہی کہاں تھا اس کی صورت تک نہ دیکھی تھی اور آنٹی......؟!

بوڑھیا نے اپنی بات جاری رکھی

"ایک فوجی آفیسر ادھر ضرور رہتا تھا، اس کا وائف...... کیا نام تھا اس کا...... یاد نہیں آرہا ہے...... ہاں...... ہاں......"

''صنوبر''، سلونی نے اس کی بات پوری کی۔

''صنوبر...... ہاں صنوبر اس کا دو بچہ''

''ہاں میں اسی کیپٹن پریتم پال کو تلاش کر رہی ہوں جس کی بیوی صنوبر ہے اور جن کے دو بچے ہیں وہ لوگ اب کہاں ہیں''

''اگر تم ان لوگوں کو تلاش کرتا ہے تو کب کا آسام چلا گیا۔''

''آسام''

''ہاں ان کا پرموشن ہوا تھا اور ٹرانسفر بھی......تم اس کا کیا لگتا''

اس سوال کا سلونی کے پاس کوئی جواب نہ تھا......وہ بے مراد واپس آئی......!!!

کئی دن بیت گئے، وہ واپس جانے کی کشمکش میں ڈوب گئی یہاں تک کہ اس کے پاس جو پیسہ تھا ختم ہو گیا اور اب ہوٹل میں ٹھہرنا ناممکن بنتا جا رہا تھا......وہ اب کہاں جائے کیا کرے......؟!

ہوٹل کے مالک رحمان دادا کو یہ جانکاری مل چکی تھی کہ سلونی کے پاس اب کوئی پیسہ نہیں اس نے کمرے سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا ہے۔

وہ اس کے کمرے میں آیا......

''تم نے کئی دنوں سے ہوٹل کا بل نہیں چکایا''

سلونی گھبرا گئی، خدا جانے اب کیا ہوگا اس کا ہاتھ سینے کی طرف اٹھ گیا۔

''ہاں سلونی نے گھبراتے ہوئے کہا

''کیوں نہیں چکایا''

''اس لئے کہ اب میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔''

''میم صاحب میں نے یہ ہوٹل اُدھار دینے کے لئے نہیں کھولا ہے''

''میں جانتی ہوں''

''پھر ہمارا پیسہ......؟

''خاموشی......طویل خاموشی!

''تم ادھر کیسے آیا''

''اپنی آنٹی سے ملنے''

''تمہارا آنٹی کدھر ہے''

''وہ وہاں چلی گئی ہے جہاں میں نہیں جا سکتی''سلونی رونے لگی''

رحمان دادا کی صورت بڑی ڈراونی تھی اس نے اپنی زندگی میں کتنی پستیاں اور بلندیاں دیکھی تھیں سلونی کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی اس کے ہاتھ کئی بار سلونی کی جانب بڑھے لیکن نہ جانے کیا سوچ کر پلٹ آئے۔ آخر ایک بار بڑھ ہی گئے......

''بیٹی تم کیا چاہتی ہو''رحمان داد کا اندر کا انسان جاگ اُٹھا،

سلونی نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا رحمان داد کی آنکھوں کی وہ تیز چمک نہ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی!

سلونی نے اپنی ساری کہانی سنادی!

رحمان داد نے کہا...... ''یہ ممبئی ہے یہاں کوئی کسی کا نہیں، کوئی کسی کو نہیں جانتا، کوئی کسی کو نہیں پہچانتا......تم خوبصورت ہو جوان ہو زمانہ خراب

ہے لوگ بُرے ہیں گھر واپس لوٹ جاؤ"

"لیکن میں گھر واپس نہیں جاسکتی"

"گھر نہیں جاسکتی تو نوکری کرو"

"کہاں"

"وہ میرے ذمہ ہے تم فنکار ہو رقص کرسکتی ہو میں تمہیں نوکری دلوادوں گا......"

رحمان دادا چلا گیا۔

سلونی سوچنے لگی رحمان دادا کی صورت میں یہ فرشتہ کہاں سے آ گیا۔ رحمان دادا کئی دن نہ ملا اس نے اپنے کمرے کے ویٹر سے پوچھا اس نے کوئی جواب نہ دیا سلونی کو وقت پر چائے ملتی کھانا ملتا ضرورت کی ہر چیز مل جاتی اور پھر ایک دن رحمان دادا اس کے کمرے میں آ گیا اور دوسرے دن سلونی کو ہوٹل انورادھا لے گیا۔

ہوٹل انورادھا......!

اس ہوٹل میں ہر شام رقص کا پروگرام ......دو گھنٹے کی نوکری معقول معاوضہ......

اس رات سلونی بہت جلد سو گئی ایک فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا اس کی خوبصورتی اور جوانی کی نگرانی کر رہا تھا......!

سلونی نے جس آرزو کے تکمیل کے لئے یہ اجنبی گھر اپنا لیا تھا وہ آرزو شاید اپنے گھر میں آنٹی صنوبر کے کمرے میں کہیں رہ گئی تھی جس قالین

کے نقش ونگار پر اس کے پاؤں تھرک اٹھتے تھے ان میں اور ہوٹل انورادھا کے چکنے سپید فرش میں ایک طویل فاصلہ تھا......ایسا فاصلہ جو ایک گھر سے بے گھر تک ہوتا ہے!

وہی سلونی تھی۔

وہی رقص تھا......لیکن فاصلہ کس قدر طویل تھا۔

ہر شام جب آرکسٹرا کی دھنیں انورادھا کی فضا میں بکھر جاتیں اور سپید چکنے چکنے فرش پر سلونی کا رقص شروع ہوجاتا تو کتنی ہی نگاہیں سلونی کو گھورتیں۔اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتیں۔ان نگاہوں میں کتنے اشارے ہوتے جب اس کا رقص ختم ہوجاتا، آرکسٹرا کی دھنیں خاموش ہوجاتیں اور سارا ہال تالیوں کی گونج سے کانپ اُٹھتا۔لوگ مسکرا مسکرکر سلونی کا سواگت کرتے۔ ان مسکراہٹوں میں کتنے پیغام ہوتے کتنے اشارے ہوتے سلونی اب بخوبی جان گئی تھی۔

کلی اب بھی تنہا تھی

پھول اب بھی پیاسا تھا

سلونی نے رحمان دادا کا ہوٹل چھوڑ کر دو کمروں کا ایک فلیٹ لے لیا۔اب اسے لینے کے لئے ہر شام انورادھا ہوٹل کے مالک کھنہ کی کار آجاتی اور پروگرام دینے کے بعد وہی کار چھوڑنے جاتی۔سلونی اب اس قدر مقبول ہوچکی تھی کہ شام ہوتے ہی انورادھا ہوٹل میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔سلونی کے رقص (رقص ایک بہانہ تھا) جسم میں دلچسپی رکھنے والے وقت سے پہلے ہی

چلے آتے یا ریزرویشن کراتے...... !سلونی کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ ہوٹل انورادھا کا مالک بھی یہ بات جانتا تھا اسی لئے وہ سلونی کی کوئی بھی بات ٹالنا نہیں چاہتا تھا۔

جب سلونی تھکن سے چور اپنے فلیٹ میں آتی تو اسے ایکدم اپنی تنہائی کا احساس ہوتا اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور اس کی نظروں کے سامنے کبھی آنٹی صنوبر کی صورت پھر جاتی اور کبھی اپنے پاپا اپنی ممی کی......!!

''یہاں آ کر مجھے کیا ملا گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں۔ مسکراتے ہوئے لب جن میں پیغام بکھرے ہیں۔ ان اشاروں اور ان پیغاموں میں میرے فن کی کوئی قدر نہیں۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لئے ہیں۔ میری جوانی کے لئے ہیں......کاش کوئی میری روح میں اترنے کی کوشش کرتا......''

اور وہ رونے لگتی!

اُسے لگتا جیسے اس کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی ہو اور اس تاریکی میں رحمان دادا کی صورت میں ایک فرشتہ کھڑا ہے۔

''گھر واپس لوٹ جاؤ''

''کاش میں نے رحمان دادا کی بات مان لی ہوتی اس وقت کچھ بھی نہ بگڑا تھا''

کبھی کبھی وہ سوچتی ''کیا ہوٹل انورادھا میں رقص کرنا ہی وہ فن ہے

جس کی میں متلاشی تھی۔ کیا یہی وہ فن ہے جس کی شمع بچپن سے میرے دل کے مندر میں جل رہی ہے......"

جب اُسے کوئی جواب نہ ملتا تو وہ تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتی......!!

وقت گذرتا رہا!

سلونی اب بخوبی اپنے اور گھر کے ماحول سے واقف ہو چکی تھی وہ تو ہوٹل انورادھا کے کھنہ کو بھی پہچان گئی تھی جو بظاہر انسان صورت تھا لیکن جس کے اندر ایک شیطان چھپا بیٹھا تھا دراصل انورادھا میں آنے والے سب لوگوں کے اندر کوئی نہ کوئی شیطان پوشیدہ تھا یہ سب چہرے نقلی تھے۔ یہ سب لباس نقلی تھے، یہ خوبصورت چہرے والے خوبصورت لباس والے کاروں اور موٹروں میں گھومنے والے دراصل انسان نہ تھے انسان کے خریدار تھے۔ انسانیت کو فروخت کر کے انسانی عظمت کو نیلام کر کے یہ کاریں اور یہ عورتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انورادھا میں آنے والے اکثر لوگ کالے بازار کے جنم داتا تھے، بلیک مارکیٹ کے پیروکار تھے سلونی ایک ایک کو پہچانتی تھی ایک ایک سے واقف تھی۔

وہ جانتی تھی کہ سیٹھ ٹنڈن جو ہر شام ایک نئی لڑکی کو لے کو انورادھا آجاتا ہے دن میں نقلی دوائیاں بنواتا ہے اور یہ دوائیاں بازار میں فروخت کرتا ہے۔ وہ سینکڑوں انسانوں کی موت کا ذمہ دار ہے احمد الدین فقیہ والا شراب کا دھندہ کرتا ہے اس کے پاس شراب کی درجنوں بھٹیاں ہیں جہاں ہر روز دیسی

شراب کی سینکڑوں بوتلیں تیار ہوتی ہیں اور خود شام کو انورادھا آ کر کافی پیتا ہے۔ امن گھوش کو بھی وہ اچھی طرح سے جانتی تھی درجنوں لڑکیاں فلموں میں کام کرنے کا خواب لے کر اپنے گھروں سے بھاگ آتی ہیں، اس کے ایجنٹ ہیں جو ممبئی میں ہر جگہ موجود ہیں پھر فلم زدہ لڑکیاں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچ جاتی ہیں اور فلموں میں کام کرنے کا خواب بس خواب ہی رہ جاتا ہے۔ وہ اس لیڈر سے بھی واقف تھی جو دن میں بیواؤں کے لئے کام کرتا ہے اور رات کو کسی نہ کسی بیوہ کے ساتھ انورادھا کے ایک کمرے میں گم ہو جاتا ہے۔

سلونی کو اب اسی ماحول اسی سوسائٹی اور اس زندگی سے نفرت ہو چکی تھی وہ یہ سب کچھ چھوڑنا چاہتی تھی لیکن ایک منوہر کے لئے مجبور تھی کیونکہ ابھی اس کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ منوہر اس کی زندگی میں ایک بھونرے کی طرح آیا تھا جس کی آمد سے پھول کی تنہائی مٹ گئی تھی۔

پھول اب تنہا نہ تھا۔

منوہر ایک گیت کار تھا اور ممبئی ایک فلم میں گیت لکھنے کے لئے آیا تھا۔ وہ فلم اس کا کوئی دوست بنا رہا تھا۔ دوست نے دوستی کا حق ادا کرنا چاہا اور منوہر کو ممبئی بلایا۔ منوہر نے گیت لکھے فلم بنی ریلیز ہوئی مگر بُری طرح پٹ گئی۔ منوہر بیکار ہو گیا۔ دوست کے پاس جو سرمایہ تھا وہ فلم کی نذر ہو گیا۔ وہ اپنے دیس لوٹ آیا۔ منوہر چالاک تھا اس نے کم ہی عرصہ میں فلمی دنیا کی نبض پہچان لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ اس شام انورادھا

میں ایک پارٹی تھی۔

منوہر بھی تھا۔

ارا کسٹرا کی دھنیں فضاء میں بکھر گئیں۔ سپید چکنے فرش پر سلونی کے پاؤں تھر کنے لگے۔ اس کے بازوؤں کی محرابیں مچلنے لگیں اور آخر میں کسی نے منوہر سے گیت سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے ایک درد بھرا گیت چھیڑا......

میں تنہا تنہا جیتا تھا۔

میں تنہا تنہا مرتا تھا......!

گیت کا ایک ایک بول سلونی کی دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا، گیت ختم ہوا، سلونی نے بھی کسی گیت کی فرمائش کی۔ منوہر نے فرمائش پوری کی اور اس کے بعد فرمائش پر فرمائش ہوئی۔

جب پارٹی ختم ہوئی اور منوہر چلا گیا تو سلونی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل پر ایک پھول اُگ آیا ہے جس کا نام محبت ہے......؟!

منوہر وہاں روز آنے لگا۔ اس کے من میں بھی شاید ایسا ہی پھول اُگ آیا تھا اور جو اسے اپنی خوشبو بکھیرنے کے لئے انورادھا لے آیا۔ پہلے شعر و شاعری ہوتی۔ پھر کافی کا دور چلتا اور پھر...... پھر اس پھول کی باتیں شروع ہو جاتیں جس کا نام محبت ہے!

منوہر اور سلونی نے ممبئی سے باہر چند دن گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ دونوں لوناولا چلے گئے...... منوہر کو پاکر سلونی اپنے آپ کو بھول گئی۔

''سلونی سوچتا ہوں آخر کب تک تمہارے سہارے جیوں گا'' وہ

اکثر کہتا۔ سلونی بات کا رخ پھیر دیتی اور کہتی۔

''تمہیں یہ موسم کیسا لگ رہا ہے...... بارش نے موسم میں جو شوخی پیدا کی ہے اس پر قربان ہونے کو جی کرتا ہے۔ من کرتا ہے کہ اس بارش میں بادلوں کی گرج میں آندھی کے شور میں گھومتی پھرتی رہوں''۔

''تمہیں سردی نہیں لگتی''،

''سردی...... جب بارش کی ننھی ننھی بوندیں بادلوں کی گرج میں رقص کرتی ہیں تو میرا من جھوم جھوم اُٹھتا ہے......''

لمحے بھیگتے رہے وقت بہتا رہا......اور ایک رات......وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ سلونی کا جسم منوہر کی باہوں میں لرز رہا تھا۔ اس کی انگلیاں سلونی کے جسم کو چھو رہی تھی...... اس کے چہرے......اور پھر رات بھیانک سے بھیانک تر ہوتی گئی اور اس بھیانک رات میں سلونی نے اپنے آپ کو لٹا دیا۔ اس خیال کے سہارے کہ منوہر اس کا ہے اور وہ منوہر کی ہے۔ اس رات سلونی نے ایک سپنا دیکھا کہ اس نے ایک خوبصورت سا سندر سا سرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ بابل کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ ڈھولک بج رہی ہے اور اس کی ممی اس کے ہاتھوں میں مہندی رچا رہی ہے اور......!!

''ممی''

منوہر جاگ گیا۔ ''کیا بات ہے سلونی''

سلونی نے منوہر کو اپنی بات سنا دی اور کہا......منوہر تم مجھے دھوکہ تو نہ دو گے...... مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے''

''کیسی باتیں کرتی ہو سلونی ...... تمہیں دھوکہ دوں......
تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں...... یہ خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے؟''

سلونی اپنا سر منوہر کے سینے پر رکھ کر سو گئی!

دوسرے دن وہ ممبئی آئے۔ اب منوہر سلونی کے فلیٹ میں ہی رہنے لگا...... گیت اور گیت کار ایک ہو گئے......!!

ایک دن منوہر مسکراتا ہوا آیا اور سلونی سے کہنے لگا......''ایک نئی فلم میں گیت لکھ رہا ہوں...... آج ہی کنٹریک سائن کیا ہے اور سائننگ آمونٹ بھی لیا ہے......''

سلونی کو جیسے اسی بات کا انتظار تھا اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ''ارے تم رو رہی ہو'' منوہر نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا'' یہ خوشی کے آنسو ہیں منوہر میں آج بہت خوش ہوں میں اس دنیا کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسانا چاہتی ہوں جس میں صرف تم ہو تمہارا پیار ہو ان نقلی چہروں اس مصنوعی زندگی سے نفرت ہو چکی ہے۔ ''لیکن تمہارا فن...... تمہارا رقص کرنے کا وہ جذبہ۔''

''وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا...... میں رقص کروں گی ناچوں گی گاوں گی لیکن تمہارے سامنے اور اپنے گھر میں...... کسی ہوٹل کے سپید فرش پر نہیں منوہر نے اس کی بات کاٹ دی......'' پرڈوسر کے یہاں جانا ہے۔''

''کہاں''

''سٹوڈیو...... تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو......''

''لیکن......میں......''

''تمہیں آنا ہی ہوگا سلونی......میرے ساتھ میرے لئے......''

منوہر سلونی کو سٹوڈیو لے گیا اس نے اپنے آنے کی اطلاع پرڈوسر کو بھجوادی وہ فوراً اندار بلایا گیا، سلونی نے اندر جانے سے انکار کیا وہ باہر ہی اس کا انتظار کرنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے سنا اندر منوہر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

''آیئے''

''ہاں''

''کنٹریکٹ پر دستخط ہوئے''

جی ہاں......شکریہ''

''تم چاہو تو ایڈوانس بھی لے سکتے ہو''

''بہت اچھا''

اور وہ لڑکی''

''لیکن صاحب''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ وہ لڑکی مجھے پسند ہے''

''لیکن وہ میری......''

پرڈوسر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''تمہاری دوست ہے محبوبہ ہے یہی کہنا چاہتے ہو...... میری بات سنو...... زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو دولت، شہرت، عزت......تو یہ دوستی اور محبوبانہ انداز ترک کردو......

تم نے نیا نیا قدم رکھا ہے اس دنیا میں...... تمہیں حاصل کرنے کے لئے ایک سہارے کی ضرورت ہے۔...... وہ سہارا تمہارے پاس ہے...... اس لڑکی کے روپ میں......"

"آپ نہیں جانتے وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے"۔

"میں سب کچھ نہیں جانتا اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔ تم کام چاہتے ہو شہرت اور پیسہ چاہتے ہو تو اس لڑکی کے ساتھ میری کوٹھی میں آجاؤ آج شام"۔

منوہر خاموش رہا۔"

"ہاں یا نا......؟"

پھر وہی خاموشی چھائی رہی جیسے منوہر کسی عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہو۔

"جواب دو"

"ٹھیک ہے"

"منیجر سے مل کر ایڈوانس لے لو...... میں نے اسے کہہ دیا ہے"

سلونی باہر سب کچھ سن رہی تھی...... منوہر کے دل پر اُگنے والے پھول مصنوعی تھے وہ پھول بھی مصنوعی تھا خوشبو کہاں سے آتی تقدس کا ملمع اُتر چکا تھا چند سکوں کے لئے منوہر اپنی زندگی اپنی محبت اور اپنے گیتوں کو فروخت کرنے پر تیار ہو گیا تھا...... منوہر جب کمرے سے باہر آیا تو سلونی جا چکی تھی۔

گھر کے باہر اس کو ہوٹل لے جانے کیلئے ڈرائیور آچکا تھا اس نے ڈرائیو سے کہہ دیا کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں اسلئے وہ آج کے پروگرام میں حصہ نہ لے سکے گی!

روتے روتے جانے وہ کب سوگئی اچانک اس کی آنکھ کھل گئی کیونکہ کھنہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مس سلونی مجھے خود ہی آنا پڑا۔ کیسی طبیعت ہے اب۔ آج ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی ہے تم کو آنا پڑے گا، چند لمحوں کے لئے ہی سہی...... میرے لئے مس سلونی پلیز......''

''لیکن میری طبیعت......''

''میری عزت کا سوال ہے......''

آخر مجبور ہو کر سلونی کو جانا پڑا!

ایک مختصر سا رقص ہوا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اچانک سلونی مائیک کے سامنے آئی......اس نے منوہر کا گیت چھیڑا

میں تنہا تنہا جیتا تھا   میں تنہا تنہا مرتا تھا......!

یہ ایک نئی بات تھی آج پہلی بار سلونی نے مائیک کے سامنے آکر ایک گیت گایا تھا اس کی سریلی آواز نے سارے ماحول کو ساری فضاء کو مسحور کر دیا گیت گاتے گاتے وہ بے تحاشا رونے لگی اور دوسرے ہی لمحے فرش پر گر گئی!

ایک کہرام سا مچ گیا۔

سلونی کو کمرے میں لے جایا گیا ڈاکٹر آیا اس نے سلونی کا بغور معائینہ کیا اور کہا کہ یہ ماں بننے والی ہے۔"

کھنہ بے ساختہ چیخ اُٹھا...... "سلونی مجھے معاف کردو...... مجھے معاف کردو" ڈاکٹر نے کھنہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو یہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے" کھنہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں..... "نہیں ڈاکٹر" ایسی کوئی بات نہیں ہے" "مگر ابھی تو آپ"

کھنہ نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا......

"دراصل آج سلونی کی طبیعت ناساز تھی ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی تھی اس لئے سلونی کو میں مجبور کر کے یہاں لے آیا ڈاکٹر نے اپنی بات دہرائی" دیکھئے یہ لڑکی ماں بننے والی ہے میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ رقص نہ کرسکے گی اگر آپ اسے مجبور کریں گے تو.....فی الحال تو میں اس کے ہسبنڈ سے ملنا چاہوں گا"۔

"دیکھئے ڈاکٹر ...... مجھے سلونی اور منوہر کے تعلقات کی کوئی جانکاری نہیں ہاں میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ دونوں ایک ہی فلیٹ میں ایک ساتھ رہتے ہیں دوست ہیں یا میاں بیوی میں نہیں جانتا......"

"ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا "میں نے انجکشن دیا ہے یہ دوائی آپ بازار سے منگوا لیجئے ہاں انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے میرا خیال ہے کہ ان کے ذہن کو کوئی صدمہ پہنچا ہے وہ ذہنی طور پر پریشان رہی ہوں گی جس کی وجہ سے وہ فرش پر گر گئیں" اور یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔

ادھر پرڈوسر کے کمرے سے جب منوہر آیا تو سلونی کو نہ دیکھ کر کچھ حیران سا ہوا۔۔۔۔۔۔ ''گھر میں ہی ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔ راستے میں وہ سلونی کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔۔۔ ''کیا وہ سلونی کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔۔۔۔۔نہیں شاید نہیں اگر ایسا ہوتا تو ہم شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہوتے اور اگر میں واقعی سلونی سے محبت کرتا تو میں نے پرڈوسر کی بات سننے سے پہلے ہی اس کا سر پھوڑ دیا ہوتا۔۔۔۔۔ میں تو ممبئی آیا ہوں نام اور شہرت حاصل کرنے کے لئے روپیہ کمانے کے لئے ۔۔۔۔۔ سلونی ۔۔۔۔۔ یہ سلونی نہ ہی کوئی اور سلونی مل جائے گی ۔۔۔۔۔ لیکن آج شام سلونی کا میری ساتھ پرڈوسر کی کوٹھی پر جانا۔۔۔۔۔ وہ تو اہم ہے۔۔۔۔۔''

سلونی گھر میں نہ تھی، منوہر نے سوچا ہوٹل میں ہوگی سلونی کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گیا۔۔۔۔۔ رات کو منوہر نے کروٹ بدلی تو سلونی کا بستر خالی پایا اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا رات کے دس بج چکے تھے وہ کچھ گھبرا سا گیا۔۔۔۔۔ پو پھٹ گئی سورج نکلا لیکن سلونی نہیں آئی۔ اس نے انورادھا ہوٹل فون کیا۔۔۔۔۔

''میں منوہر بول رہا ہوں''

''منیجر کی آواز سنائی دی۔۔۔۔۔ ''منوہر صاحب آپ اب تک کہاں تھے ہم تو کل شام سے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ سلونی۔۔۔۔۔''

''کیا ہوا سلونی کو۔''

''سلونی کل اچانک گاتے گاتے بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر نے

معائنہ کیا دوائی دی لیکن رات کو اس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور کھنہ صاحب نے انہیں نرسنگ ہوم میں ایڈمٹ کروالیا......''

''نرسنگ ہوم''

''ایک اور بات......ان کا abortion ہوگیا ہے وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی......آپ کے خلاف FIR درج کیا گیا ہے......''

منوہر کے پاؤں سے جیسے زمین سرک گئی......!

''اب کیا ہوگا؟''

گھبراتے ہوئے قدموں نے منوہر نرسنگ ہوم جا پہنچا آہستہ سے سلونی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا......سلونی نے منوہر کو دیکھا تو کمبل سے اپنے سارا جسم کو چھپالیا......منوہر کو ایک بار پھر زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی!

''سلونی'' اس نے آہستہ سے کہا

سلونی خاموش رہی۔

''میری جان سلونی'' منوہر کی آواز ابھری

''منوہر تم'' سلونی نے کمبل کو اپنے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا''

منوہر تم چلے جاؤ یہاں سے......دور ہو جاؤ میری نظروں سے......میں نے سب کو کہہ دیا ہے کہ منوہر صرف میرا دوست ہے......بچہ......بچہ تمہارا نہیں تھا''

منوہر نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

''مگر سلونی''

''تمہارا کوئی قصور نہیں'' وہ رونے لگی، اور روتے روتے کہا ''ہاں تمہارا کوئی قصور نہیں قصور صرف میرا ہے میں نے تم سے محبت کی تم پر اپنی زندگی لٹا دی تمہیں سکون دیا گھر دیا...... ہر سہولیت دی اور تم......تم تو صرف چوری کرنا جانتے ہو ڈاکہ ڈالنا جانتے ہو لیکن چور یا ڈاکو کا بھی ایمان ہوتا ہے ایک منزل ہوتی ہے تمہارا کوئی ایمان نہیں کوئی منزل نہیں تم تو ایک چور ایک ڈاکو سے بھی بدتر ہو......خود تو مجھے لوٹ لیا اور اب میرا سودا کرنا چاہتے ہو......''

''سلونی تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو ہاں شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تمہیں آرام کی ضرورت ہے......پھر بھی......''

''پھر بھی کیا''

''اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو مجھے معاف کر دو''

''تمہیں معاف کر دوں...... ایک بردہ فروش کو......عورتوں کے بیوپاری کو...... تمہیں شاید کسی ماں نے جنم نہیں دیا ہے...... تمہارے گھر میں شاید کوئی بہن نہیں ہے......اس لئے عورت کی عزت کرنا تم نے سیکھا ہی نہیں ہے......تم ذلیل ہو...... جاؤ......''

منوہر کمرے سے باہر چلا آیا......!!!

رات کو کھنہ اور ڈاکٹر ایک ساتھ سلونی کو دیکھنے نرسنگ ہوم آ گئے۔

''کیا حال ہے'' ڈاکٹر نے پوچھا

''جی رہی ہوں'' سلونی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے

کہا۔

''تم تو زندگی سے بے زار نظر آ رہی ہو......ادھر کھنہ صاحب ابھی تک پولیس سٹیشن میں تھے......''

''مگر کیوں......''

''ڈاکٹر رہنے دیجئے پولیس سٹیشن جانا تو ہم ہوٹل والوں کا معمول ہے......یہ بتایئے سلونی کو کب تک یہاں رہنا پڑے گا۔''

''یہ تو سلونی پر depend کرتا ہے۔ اگر اس رات میرے جانے کے بعد سلونی بیڈ سے اترنے کی کوشش نہ کرتی ......تو ......آپ کہہ رہے تھے کہ یہ ہوش میں آتے ہی بھاگنے لگی'' سلونی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپالیا۔

''OK......جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے......لیکن شاید رقص نہ کر سکے گی۔''

''مگر ڈاکٹر''

''دیکھئے یہ میرا ذاتی خیال ہے ہے ابھی کچھ دن اور یہاں رہنے کے بعد اور کچھ x-rays لینے کے بعد اصلیت کا پتہ چلا جائے گا......''

ڈاکٹر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

''آپ پولیس سٹیشن کیوں گئے تھے''

''یونہی''

''پھر بھی''

''تم نے منوہر کو صاف بچالیا لیکن اس کے نتیجے میں تم پر illegal

abortion کا کیس بنا۔"

"پھر"

"میں نے وہ کیس close کروالیا......"

"آپ نے ایسا کیوں کیا......"

"اپنے مطلب کے لئے......تاکہ تم پھر سے میرے ہوٹل میں رقص کرسکو گی گا سکو گی ناچ سکو گی"

"میں رقص کر بھی سکوں گی کہ نہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا آپ نے شاید ڈاکٹر کی بات غور سے نہیں سنی۔"

"سن بھی چکا ہوں اور جانتا ہوں......"

"لیکن پولیس سٹیشن......کیس......

"تم خوامخواہ گھبرا رہی ہو......پیسہ کام آتا ہے ہر جگہ ہر سمے......اور پھر سلونی...... میں کوئی دیوتا نہیں...... میں بہت برا آدمی ہوں...... ہاں سلونی......"

سلونی کے کان کھڑے ہو گئے ایک دبے دبے ڈر نے سر اُبھارنا شروع کیا......کہیں منوہر کا دوسرا روپ تو نہیں......"

"سنو سلونی......تم منوہر کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن تم نے اُسے صاف بچالیا تم میرے ہوٹل میں کام کرتی ہو......پولیس کو منوہر میں کوئی دلچسپی نہ تھی وہ تو ان کے لئے ایک چھوٹی سی مچھلی تھی......نہ پیسہ نہ روپیہ، نہ گھر نہ ٹھکانہ......پولیس کی ضرورت تھی ایک بڑی مچھلی کی......اور وہ مچھلی انہیں

میری صورت میں نظر آئی...... پولیس کو خاموش کرانا میں بخوبی جانتا ہوں......"

"اور ڈاکٹر"

"وہ اپنا دوست ہے نرسنگ ہوم کے ریکارڈ میں معدے کی بیماری دکھالی گئی"

"لیکن آپ نے یہ سب کیوں کیا...... کس لئے کیا"

"تمہیں پانے کے لئے سلونی......"

یہ کہتے ہوئے کھنہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کئی دن ایسے ہی بیت گئے لیکن اس دوران سلونی کو بتایا گیا کہ منوہر اس کے فلیٹ سے اپنا مختصر سا سامان لے کر کہیں اور چلا گیا ہے...... فلم میں گیت لکھنے کا جو وہ کنٹریکٹ سائن کر چکا تھا وہ پرڈیوسر نے کنسل کر دیا ہے اور اُسے فلم سے باہر کر دیا گیا ہے...... اور سب سے اہم خبر سلونی کے لئے یہ تھی کہ وہ رقص نہ کر سکے گی کیونکہ پیر فرش پر گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی میں ایک نقص پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس ٹانگ میں constant pump رہے گا......"

نرسنگ ہوم میں اس کا آخری دن تھا۔ کھنہ اسے لینے آیا تھا۔

"سلونی اب تم رقص نہ کر سکو گی ہوٹل انورادھا کے چکنے فرش پر کبھی تھرک نہ سکو گی...... تم نے اپنے بارے میں کیا کچھ سوچا ہے...... میری تجویز...... میرا مطلب ہے کہ چند روز قبل میں نے......! کھنہ یہ کہتے کہتے

رُک گیا......

''اچھا میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں شاید تمہیں اس کہانی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئے پھر بھی......شاید تم سوچ رہی ہو ہر مرد بے وفا ہوتا ہے بُرا ہوتا ہے کسی حد تک یہ درست بھی ہوسکتا ہے......یہ میری کہانی ہے سلونی...... میں پچیس سال کی عمر میں ممبئی آگیا پیسہ میرے پاس تھا پہلے ایک چھوٹی سی دوکان سنبھالی ٹی سٹال چھوٹے موٹے کام کیئے۔ کالے بازار والوں کا ساتھ دیا......میرے پاس اور پیسہ آگیا......آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا اور ہوٹل بزنس میں ہاتھ ڈالا......آج میں انورادھا ہوٹل کا مالک ہوں......''

''آپ اپنی کہانی مجھے کیوں سنانا چاہتے ہیں''

''صرف اس لئے کہ ہم دونوں کے جاننے والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں کا......''

''لیکن یہ تو غلط ہے......''سلونی نے بات کاٹتے ہوئے کہا''ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ غلط ہے......لیکن شاید یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں......میرا ایک بیٹا بھی ہے......تم مجھے بولنے دو سلونی......انورادھا سے مجھے بے حد پیار تھا......''

''انورادھا......کون انورادھا''

''میری بیوی کا نام بھی انورادھا ہی تھا''

''تھا......کیا مطلب''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں......وہ میرے بچے کی ماں بننے والی

تھی ...... لیکن وہ بچے کو جنم دے کر اپنے آپ کو بچا نہ سکی ...... وہ مرگئی، آپریشن ٹیبل پر ہی مرگئی۔"

"اور آپ کا بچہ ......"

"میرا بیٹا صحیح سلامت ہے اور وہ ڈون سکول میں پڑھ رہا ہے ......
اور میں یہاں ممبئی میں ہوٹل انورادھا میں جی تو رہا ہوں مگر بے مقصد بے معنی ......!

"وہ بن ماں کا بیٹا ہے ...... اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ تم میری انورادھا کا روپ بنالو ...... میرے بیٹے کی ماں بن کر ...... سلونی ہاں کہو ...... ہاں ......"

سلونی نے آہستہ سے کہا

"آپ کی زندگی کی کہانی پر درد ہے آپ کے سینے کا گھاؤ گہرا ہے آپ نے مجھے پر بہت احسانات کئے ہیں مہربانیاں کی ہیں میں نے آپ کے جس روپ کے بارے میں سوچا تھا وہ روپ وہ میری آنکھوں کا دھوکہ تھا اور اب جو میں آپ کو دیکھ رہی ہوں آپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں جاننے لگی ہوں تو آپ مجھے ایک دیوتا نظر آتے ہیں ...... آپ کو دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ایک بار پھر رحمان دادا میری زندگی میں آیا ہے ...... آپ پرستش کے قابل ہیں کھنہ جی ......"

"مگر سلونی"

"میں نے کہا کہ آپ دیوتا ہیں فرشتہ ہیں ...... میں آپ کی پرستش

کر سکتی ہوں آپ سے شادی نہیں کر سکتی ...... اور شادی تو میں اب عمر بھر نہیں کروں گی عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے ایک ہی بار پیار کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے میں نے منوہر کو بے تحاشا چاہا...... لیکن اس میں محبت کا کیا دوش ...... محبت ایک جذبہ ہے ایک خوبصورت ملاپ ہے ایک مقدس رشتہ ہے......"

"مگر منوہر تو......"

"ہاں میں جانتی ہوں کہ اب وہ میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئیگا، میں آنے بھی نہ دوں گی۔ وہ میرے لئے اور میں اُس کے لئے مر چکی ہوں لیکن محبت تو نہیں مرتی محبت تو امر ہے......"

"میری بات تو سنو"

"نہیں میں اپنے وطن لوٹ جاؤں گی جس مٹی نے مجھے جنم دیا وہ مٹی بلا رہی ہے جن گلیوں میں میرا بچپن گزرا ہے ان گلیوں کو میرے پاؤں کی آہٹ کا انتظار ہے وہ میری اپنی مٹی ہے وہ مجھے گھر سے بے گھر ہوتے نہیں دیکھ سکتی......!"

❁❁❁

ناولٹ

آؤ سو جائیں

نور شاہ

انتساب

بشیر شاہ

اور

ڈاکٹر حسین شاہ

کے نام...........!!

نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، انداز بیان میں جو شگفتگی، رچاؤ اور موسیقی ہے وہ تو کچھ حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہینِ منت، نور شاہ بطور کہانی کار مقبول و معروف ہیں، نور شاہ کی تحریروں میں شعور و فکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں، زبان و اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے.........

''آؤ سو جائیں'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے، وہیں ایک یُگ کی کہانی بھی ہے۔ اِس ناولٹ میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کُشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔

اعجاز صدیقی (مرحوم)
ممبئی

(ماہنامہ شاعر ممبئی کے ناولٹ نمبر میں شائع ناولٹ ''آؤ سو جائیں'' سے)

رات کتنی اندھیری ہے۔کل اور آج کی رات میں کتنا فرق ہے، کتنا بڑا فاصلہ ہے۔ اس فاصلے کو کن قدموں سے عبور کروں۔اس اندھیرے کو کن روشنیوں کے سہارے دور کروں ......تھک سا گیا ہے میرا وجود، روٹھ سا گیا ہے میرا دل۔سونا چاہتا ہوں لیکن نیند بھی نیلما کی طرح روٹھ گئی ہے۔ یہ نیند بھی عورت کی سوچ ہے۔ عورت کا سپنا ہے۔میری زندگی میں آئی بھی تو بڑی جھجک کے ساتھ، شرمائی شرمائی سی۔!!

قد پورا پانچ فٹ ہو۔پمپوش جیسا ملائم ملائم سا چہرہ ہو۔آنکھیں مست مست اور دانت سفید موتیوں جیسے ہوں۔آواز میں بے پناہ مٹھاس ہو اور باتیں کرتے وقت پلکیں جھک جھک جاتی ہوں، بھرے بھرے رخسار میں اچانک ایک گڑھا سا پڑ جاتا ہو، چلتے وقت انگ انگ رقص کرنے لگتا ہو......تو کیا خشک زندگی میں محبت کی پہلی ہلکی سی حرارت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا۔

یہ کہتے کہتے وہ سو گیا ہے۔ میرا دوست ، خوبصورت بیوی ، خوبصورت نیند، خوش بخت انسان، میں بھی سونا چاہتا ہوں......!

نیند نہیں آتی۔؟

شبنم کے قطرے جب کنول کے پتوں پر بکھر جاتے ہیں تو ایک عجیب سی بے قراری کا احساس ہوتا ہے۔ ایک اَن دیکھی سی تمنا دل کے کسی تنہا گوشے میں دھڑکنے لگتی ہے، ان دھڑکنوں میں یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں سنور جاتی ہے۔ اور اچانک جیسے ہواؤں میں مٹھاس گھل جاتی ہے۔ سپنوں بھری فضائیں مہک اُٹھتی ہیں۔ پیڑوں کے نیلے اور چاندی ایسے رنگ سواگت کرتے نظر آتے ہیں۔ ہاں سمے سمے کی بات ہے نا۔ میری اُجاڑ اُجاڑ سی ویران زندگی میں جب یہ لمحہ نیلما کے رنگ وروپ میں آیا تو یک لخت جیسے شبنمی لمس کا احساس ہوا۔ تب میں نے صرف ایک لمحے کے لئے سوچا تھا۔ کیا عورت کبھی اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے۔ میں نے تب نیلما نہیں دیکھی تھی، شاید نیند آرہی ہے۔ آنکھوں سے کسی کا آنچل چھوگیا ...... لیکن نیلما میرے دوست کی خوبصورت نیند۔!!

بات صرف میری نہیں، میرے کچھ اور بھی ساتھی ہیں۔ پر میرے اور اُن کے درمیان ایک مختصر سا فاصلہ ہے۔ جیسے ڈل جھیل کی بے کراں وسعتوں پر پھیلی ہوئی دوکشتیوں تلے ایک دوسرے سے ٹکراتی ہوئی لہریں، ایک دوسرے سے گھل مل کر بھی ایک دوسرے سے اجنبی، ایک دوسرے سے ٹکرا کر کر بھی دُور ہوتی ہیں۔

لیکن وہ اجنبی پن کا احساس۔!

وہ کون سے لوگ ہیں جن کی زندگی میں کوئی شبنمی لمحہ نہ آیا۔ میری ہی طرح جن کی ساری زندگی بے کیف و بے رنگ رہی ...... اقبالؔ ......

راشد......بنسی......پال......برج! سینکڑوں نہیں شاید لاکھوں نام۔!

کیوں نہ آج اپنی ادھوری کہانی لکھ ڈالوں۔ لیکن نیند نے وفائی کی تو۔؟

یہ ایک اجنبی دور کی کہانی ہے۔ اس دور کے سارے کردار اجنبی سے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے بھی اپنا کردار اجنبی سا لگ رہا ہے۔ لیکن اس اجنبی پن میں بھی میں اپنے خیالات اور اپنی تحریر میں صاف گو بن کر اپنے اور اُن سب کے جذبات کی عکاسی کرنا چاہتا ہوں۔ خیالات کی نوک پلک سنوارنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اجنبی پن کا یہ احساس ختم ہو جائے۔ کبھی میں نے سوچا تھا کہ جب میں اپنی زندگی کے خدوخال اُبھاروں گا تو اپنے قلم کی سیاہی میں چاند اور ستاروں کی ساری سندرتا، ساری چمک گھول دوں گا۔ اور ایک ایسی کہانی کی تخلیق کروں گا جس میں صرف پھول کھلے ہوں گے، نیلی نیلی جھیلیں اور اُن کی چھاتی سے لگے ہوئے کنول کے پھول۔ میں اپنے سرسبز پہاڑوں کی کہانی لکھوں گا۔ چیڑ، دیودار اور چنار کی کہانی، ریشمی گھاس سے اَٹے ہوئے مرغزاروں کی کہانی، میں نے چاہا تھا اپنی کہانی میں اُس حسن کو سما دوں گا جو شبنم سے منہ دھوتی کلیوں میں ہے۔ مدھ مست آنکھوں میں ہے۔ پر جب اس کہانی نے جنم لیا تو میں اپنے اردگرد اور نزدیک پھیلی ہوئی گندگی، غلاظت اور بدصورت جراثیموں میں پھنس چکا تھا اور میں نے صرف کالی راتیں دیکھیں۔ ڈوبتے سورج دیکھے۔ گرہن کے شکنجے میں جکڑے چاند دیکھے اور......!

نیلی کا پوار نام نیلما ہے......نیلم۔!

نیلما اور آکاش۔!!

کتنی بڑی وسعتوں کی دنیا۔ کتنی بڑی تمنا کا احساس......لیکن کیسی نیلما اور کیسا آکاش...... پاؤں دھرتی سے چمٹے ہوئے اور یہ دھرتی مجھے پسند ہے۔ شاید یہی پسند مجھے اس کے قریب لے آئی۔ جانے یہ میرے شعور کی باتیں ہیں یا لاشعور کی۔ جانے یہ کیسی سوچ ہیں، کس رنگ کی......!!!

آج میں بڑا دکھی ہوں اور نیند دکھ کا ساتھ نہیں دیتی۔ کاش کہ نیند بھی میری بیوی ہوتی، محبوبہ نہیں، نیلما نہیں، شاہدہ نہیں، اور آنکھوں کے سامنے چند چہرے ہیں۔ کچھ اپنانے کو تیار کچھ......اور نیلما کا چہرہ

وہ ایک سرد سی رات تھی جب برج نے اُسے نیلی کہا تھا۔

نیلی۔!

سنگم۔!

آکاش اور دھرتی کا۔

اندھیرے اور نور کا۔

نیلی کی ایک ساتھی بھی تھی۔ اُس کا نام میمی ہے۔ پر میمی نیلی کی طرح لڑکی نہیں۔ چلتا پھرتا جادو نہیں اور نہ ہی دل کی تاریکیوں کو روشنی بخشنے والا دیا......تو یہ مہندی، کالے اور سپید رنگ کی ایک معصوم سی بلی ہے۔ جنگلی بلی!

آج میں اپنے کھوئے ہوئے وجود کو ڈھونڈ رہا ہوں اور میمی وہ تو جا چکی ہے۔ کل کا وعدہ!

کل کی کیا بات ...... کیا ہوگا، کون جانے۔ کیوں نہ آج ان سسکتے لمحوں میں یہ کہانی مکمل کرلوں، انجام سے بے خبر، انجان اور ادھوری ...... بالکل میری اپنی زندگی کی طرح۔!

یہ میرا وجود کس قدر اجنبی اجنبی سا ہے آج۔ یہ لمحے کتنے عجیب سے ہیں اور مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں یہ زہریلے ناگ بن کر مجھے ڈس نہ لیں۔ یہ آہستہ آہستہ سے رینگتے ہوئے ناگ کبھی ایسے نہ تھے۔ کبھی یہ انسان تھے۔ چلتے پھرتے اور بولنے والے انسان، میرے دوست میرے ساتھی۔ جو نیلی سے ملے، جنہوں نے نیلی کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی۔ نیلی سے پیار و محبت کی باتیں کیں۔ جنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن کے دریچوں کو بند کر کے میمی کو نیلی کا روپ دیا۔ اس کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ایک شبنمی لمس حاصل کرنے کے لئے اُس لمحے کو جاوداں بنانے کے لئے اور...... اپنے اندر کے حیوان کو سُلانے کے لئے۔

اور جب انسان حیوان کی سی صورت اپناتا ہے تو وہ ناگ بن کر ڈس لیتا ہے۔

برجؔ جا چکا ہے،۔ یہ برجؔ ہی تھا جس کی وساطت سے میں نیلی سے ملا اور برائے پیلس کمرہ نمبر ۹۔ کی شامیں اور کمرہ نمبر ۱۰۴ کی راتیں فراموش کر چکا ہوگا۔ البتہ میں اب بھی اُن راتوں اور شاموں کے چند سسکتے لمحوں کو اپنے سینے کی قبر میں دفنائے اپنے اجنبی اجنبی سے وجود میں جھانک رہا ہوں۔

برجؔ نے نیلی سے کہا تھا...... آؤ چلیں دور سونہ مرگ کی برف سے

ڈھکی چھپی چوٹیوں میں گھرے ہوئے ریسٹ ہاؤس میں، جس کی برف آلود دیواریں تمہارے جسم کی گرمی سے پگھل جانا چاہتی ہیں۔''

میں خاموش رہا۔!

نیلی نے میری طرف دیکھا اور میرا گلاس بھر دیا۔

برج نے پھر کہا۔

''آؤ، چلیں دور، پری محل کے ویران کھنڈورں میں۔

جہاں کئی سو سال پہلے تم نے ایک برفانی پری کا روپ اپنا کر سنگ مرمر کی فرش پر رقص کیا تھا۔''

میں نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کیا۔

اُس نے پوچھا۔

''کیا آپ بھی جنم جنم میں یقین رکھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''میں نے زندگی میں ایک ہی بار جنم لیا ہے۔ اور ساری زندگی اسی جنم میں پوری کروں گا۔ پر میں نہیں جانتا کہ میں نے کب جنم لیا۔ اور میرا یہ جنم کب ختم ہوگا۔''

''کیا شاعری ہے۔'' برج نے میمی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ...... '' تب تم کہاں تھے۔ جب نیلی برفانی پری کے روپ میں پری محل میں رقص کیا کرتی تھی۔''

میں نے کہا...... '' برج بھائی، میں اُس سمے جنم لے چکا تھا۔ اور میں

بھی اُسی پری محل میں تھا دارا شکوہ کے روپ میں اور شاید تم نہیں جانتے، نیلی اُس وقت میرے لئے ہی رقص کیا کرتی تھی۔''

''یہ سب جھوٹ ہے''...... نیلی، یہ آدمی جو اپنے آپ کو کہانی کار کہتا ہے بڑا مکار ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آنا، ویسے اس کی شخصیت بڑی پیاری ہے۔ لیکن شراب پی کر بہکتا ہے۔ بہکا تا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں، برسوں سے جانتا ہوں۔''

''برج، تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔''

''نیلی ڈیر، اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ ایک جادوئی رتھ پر سوار ہو کر کہیں دور چلا جاؤں۔''

''کہاں۔؟

''جہاں صرف میں ہوں گا اور تمہاری آغوش۔''

اور یہ تمہارا دوست۔''

برج نے بات بدل دی...... ''تمہارا گلاس خالی پڑا ہے۔ بھر دوں۔''

''ہاں اور......!''

نیلی سے میری ملاقات کی نیم تاریک رات ختم ہوئی۔ اور یہ زندگی ایک ایک لمحہ جوڑ کر بنی ہے۔ ہر لمحے کی اپنی اہمیت ہے۔ ہر لمحہ دوسرے سے مختلف ہے۔ کچھ لمحے مختصر ہو کر بھی اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ ان کے سائے ہماری ساری زندگی کو تاریک بنا دیتے ہیں۔

رات بڑی تاریک ہے۔

نیند نہیں آتی ۔!!

میں اپنے کمرے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں، کمرے کی کھڑکیاں بند ہیں۔ ذرا ان کھڑکیوں کو کھول دوں پہلے۔ شاید شنکرآ چاریہ کی اوٹ سے چاند نکل رہا ہو۔ شاید چاند کی دھیمی دھیمی سی نرم نرم سی ٹھنڈی ٹھنڈی سی چاندنی میں نیلی کو اور اپنے قریب پاسکوں۔ شاید ڈل جھیل کی برف سی ٹھنڈی لہروں کی سرد ہوا کے جھونکے مجھے سکون بخش سکیں...... میں نے کھڑکی کھول دی اور چاند کی چاندنی نہ نکھری ہو اور سرد ہوا کے جھونکے کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردوں میں کوئی سرسراہٹ پیدا نہ کر سکے تو ...... میرا سارا وجود رات کے ان سسکتے لمحوں میں بکھر جائے گا۔ بکھر بکھر کر پگھل جائے گا۔ اور میں ساری عمر اپنے وجود کو نہ ڈھونڈ پاؤنگا۔ اور پھر زندگی بھر اس کہانی کو نہ لکھ سکوں گا۔

نیلی کی یہ کہانی بھی ایک ایسی ہی نیم تاریک رات کو شروع ہوئی، اس کمرے میں بھی تو نیم تاریک اندھیرا تھا۔ حالانکہ اوبرائے پیلس کے کسی کمرے میں تاریکی نہیں ہوتی اور پھر کمرہ ۱۰۴ کی بات ہی تو دوسری ہے...... کیا ہوا بجلی کے قمقموں میں ایرانی قالین چمک رہا تھا، دیواروں کا رنگ وروغن مسکرارہا تھا۔ بستر کی شکنیں حرارت اور گرمی کی گواہی دے رہی تھیں اور کیا ہوا شراب سے لبریز جام نظروں کے سامنے تھے۔ قمقموں کی روشنی دل کو کہاں تک نور بخش سکتی ہے۔ دل کی روشنی کے لئے اپنا خون جگر پینا پڑتا ہے۔ اپنے آپ میں کھو جانا پڑتا ہے جیسے میں کھویا تھا۔ جیسے نیلی کھوئی تھی۔ برج کھویا تھا اور جیسے ایک رات راشد کھویا تھا۔ بنسی، اقبال یا اشفاق کھو گئے

تھے یا وہ خوبصورت منسٹر کھو گیا تھا جو نیلی کو دیکھنے کے لئے دلی سے سرینگر چلا آیا تھا۔ پر کھونے کھونے کی بات ہوتی ہے نا، وہ سب ایسے کھو گئے۔ جیسے ڈل جھیل کی گہرائیوں میں پتھر، جو پھر اُبھر نہ سکے۔ اگر اُبھرا تو صرف میں۔ وہ سب تو مئے ناب پی کر قمقموں کی روشنی میں نیلی کے جسم کو دیکھتے رہے۔ تلاش کرتے رہے۔ میمی کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہے...... میں نے اپنا خون جگر پیا شراب کی شکل میں اور پہلے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ اُس کے دل میں اُترا اور ایک کہانی نے جنم لیا۔ انجام سے بے خبر ایک کہانی ...... اور اُس کہانی کا کوئی ہیرو نہیں۔ کوئی ہیروئن نہیں، سب ہی ولن ہیں۔ سبھی ایک دوسرے کو اجنبی اجنبی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سبھی کی نظروں میں شک کی پرچھائیاں ہیں اور شاید اسی لئے یہ کہانی ایک اجنبی دور کی کہانی ہے۔

برجؔ کے بعد میں اس کہانی میں آیا۔ لیکن اُس وقت وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے۔ اور اُن تاروں سے نکلا ہوا نغمہ فضاؤں کی نذر ہو چکا تھا اور آکاش کی بے کراں وسعت میں لیٹا ہوا چاند دھند تلے گم ہو چکا تھا۔

یہ برجؔ کے جانے کی بات ہے۔ میں نے نیلی سے فون پر بات کی اور پہلی ہی بات میں برجؔ کے ساتھ اس کی شادی کا اشارہ کیا۔

اُس نے کہا.......... ''میں تمہاری راہ دیکھوں گی۔''

اُس رات راشد میرے ساتھ تھا۔

چھوٹی سی تپائی پر گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ میں چپس

پڑے تھے۔ تھرماس میں چشمہ شاہی کا یخ بستہ ٹھنڈا پانی تھا اور بوتل راشد کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ ٹیپ ریکارڈ پر کوئی گیت بج رہا تھا۔ گیت کے بول مجھے یاد نہیں۔ البتہ ایک بہت ہی رومانی گیت تھا وہ۔ دو روحوں کا ملاپ۔ دو جسموں کا ٹکراؤ .... پہلا پیگ ہرے کانچ کے گلاسوں میں ڈالا گیا۔ ہم سب نے سِپ کیا۔ راشد مہاراجہ ہری سنگھ کے ماضی میں کھو گیا۔ اُس کی زندگی کا میعار۔ اُس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ .... آج بھی اوبرائے پیلس کی عظیم عمارتیں اُس کے رہنے سہنے کے ڈھنگ کی گواہی دے رہی ہیں۔ آج بھی اوبرائے پیلس کے کمروں کی دیواروں پر ہماری غلامی کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ بس رنگ بدلنے سے ماضی کے سائے ساتھ نہیں چھوڑتے، آج ان کمروں میں اگر اوبرائے پیلس کا ہوٹل جگمگا رہا ہے تو اب سے کئی سال پہلے ان کمروں کے مکینوں نے سالہا سال کشمیر پر حکومت کی ہے۔

کتنا بھیانک دور تھا۔!

اور ایک دن ان عمارتوں میں آگ لگ گئی۔ اُس دن ان عمارتوں کے پتھر تراشے ہوئے خوبصورت پتھر چیخ اُٹھے۔ ان چیخوں میں بادشاہ کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ لیکن یہ چیخیں آگ کے شعلوں میں دب کر رہ گئیں...... اور آزادی کا سورج طلوع ہوا۔

راشد آہستہ آہستہ اپنا جام خالی کرتے ہوئے ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ اور جیسے اُس کی نظروں کے سامنے ٹنگمرگ کی سبز زمین گھوم گئی۔ جہاں اُس نے ان ہی دنوں ایک چھوٹی سی ہٹ بنالی ہے۔

ٹنگمر گ۔!

سمے اور جل نے مل کر ٹنگمرگ کو تراشا ہے۔ ایک طرف دیودار اور چیڑ کے درخت، چنار کے پتوں کا لال رنگ، کھیتوں میں اناج کی سنہری بالیاں اور دوسری جانب یخ ٹھنڈا جل، دور دور تک بہتا ہوا پانی، رنگوں کے نئے روپ کیلئے ہی شاید راشدؔ نے ٹنگمرگ میں مکان بنالیا ہے۔ کیونکہ یہاں سے لال نارنجی رنگ زوجی لا چوٹی پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ اور پھر یہاں اتنے پھول ہیں، نیلے پیلے پھول، اتنے سندر جیسے کسی نے ان پر رنگوں کی پچکاریاں کی ہوں۔ یہاں چڑیوں کے راگ سے رات گا اُٹھتی ہے۔ پانی کی آواز سے ندی نالے گنگناتے ہیں۔ اِشٹابری کی خوشبو میں ڈوبی ہوئی دھوپ کس قدر صحت مند ہے.........اسی ماحول میں راشدؔ کا مکان ٹنگمرگ کی وسعتوں میں کھڑا ہے۔ اکیلا تنہا .... جیسے میں۔ میری زندگی۔ میرا جیون!

اور پھر راشدؔ نے باتیں کیں۔ گھر بنانے کی باتیں۔ گھر سجانے کی باتیں.....خوب باتیں کیں!

جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کیا۔ نیلی نے پھر بھرا۔ میں نے ایک اور بار خالی کیا۔

اور راشدؔ کی طرف دیکھا۔

راشدؔ نے پوچھا..... ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

''تم ہوش میں نہیں ہو۔ یہ ہوٹل کا کمرہ ہے جہاں بیٹھ کر گھر کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔صرف گھر کا ماحول بدلنے کے لئے ہوٹل کے کمرے کا سہارالیا جاتا ہے۔''

نیلی کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔وہ بھی ایک گھر کے متعلق سوچ رہی تھی شاید.........اپنے گھر کی باتیں ،گھر بنانے ،سجانے اور سنوارنے کی باتیں۔

نیلی نے پوچھا.........''آپ سے برجؔ نے اور کیا کہا۔''

میں نے کہا ''وہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''شادی، مجھ سے.........کیوں؟''

''کیونکہ وہ آپ سے پیار کرتا ہے۔''

''پیار یا تفریح۔؟''

راشدؔ نے کہا.........''ایک بات میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔''

''کہئے۔'' نیلی نے جواب دیا۔

''تفریحی پیار بھی زندگی کا المیہ بن سکتا ہے۔''

وہ رو پڑی ۔ میں نے سوچا، جانے ان مست مست سی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے اُمڈ آتے ہیں۔ نیلی کی یہ آنکھیں اگر زندگی بھر آنسو بہاتی رہیں تو کیسے گزرے گا یہ جیون۔کیسے پورا ہوگا زندگی کا یہ طویل چکر.........؟

میں نے کہا.........''دیکھ نیلی مت رو۔ یہ رونے کا سمے نہیں۔

زندگی کا دوسرا نام مسکان ہے۔اور بن مسکان کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔''

اس نے اپنی جھکی جھکی سی پلکوں کو آہستہ سے حرکت دی۔اور میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''مجھے اپنے آنسوؤں میں میرے دل کی دنیا تاریک ہونے کی داستان پوشیدہ تھی۔'' میرے ذہن کے کسی گوشے سے ایک لوک کہانی اُبھر آئی.........ایک تھی گڑیا، پھر اُس نے ایک شہزادی کا روپ اپنا لیا۔اور پھر ایک دیو آیا۔

بچپن کے گھروندے ڈھ گئے۔!

اُس رات ہم نے پرئمیر ہوٹل میں کھانا کھایا۔

ہم کھانا کھا رہے تھے اور چکنے فرش پر ایک نیم عریاں کالی کلوٹی سی لڑکی مغربی دھنوں پر رقص کر رہی تھی......وہ رات کسی بات کا پتہ دے رہی تھی۔کئی باتوں کا انکشاف کر رہی تھی۔مسکراتے لب، دونوں شانوں پر بکھرتے اور لہراتے کالے کالے بال.........نرم و نازک ریشمی لباس جو نیلی کے بدن کو اپنی آغوش میں سنبھالے ہوئے تھا۔ ہولے ہولے آہستہ آہستہ چمٹا رہا تھا۔اور رہ رہ کر اُس کی گدگدیاں کر رہا تھا۔

موسیقی اُبھر رہی تھی۔کالی کلوٹی لڑکی محو رقص تھی، اور راشد کہہ رہا تھا۔

"we share a room in the office"

نیلی نے پوچھا۔بڑی سادگی تھی اُس انداز میں۔

"what about your real life"

راشدؔ نے سوچ کر کہا............''صرف ہمارے دفتر کا کمرہ مشترکہ ہے۔اور......!''

''اور کیا۔؟''

''اور شراب۔!''

''بس۔!''

"yes, but I hope my friend has no objection to share you with me"

نیلی نے پوچھا......"me"

"yes"

''کیا مطلب۔؟''

"Let us go for a long drive"

نیلی نے میری طرف دیکھا۔راشدؔ نے بھی میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا۔

رقص تھم چکا تھا۔ میں نے نیلی کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ وہ آنکھیں جیسے بتا رہی تھیں۔

''تم ایک عورت کے جسم سے کیا یہی سلوک کرتے ہو''۔

ہم دونوں اُسے چھوڑنے او برائے آئے۔راشدؔ باہر میرا انتظار کرتا رہا۔اور میں نیلی کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔''

''ہمارا ایک رشتہ بن چکا ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا............ ''کون سا۔؟''

''ذہنی رشتہ۔!''

''میں سمجھتا ہوں ذہنی رشتوں سے جسمانی رشتے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔''

میں نیلی کے قریب سرک گیا۔

''اور برج۔'' اُس نے پوچھا

''ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''ہو تو جائے گی۔''

''ضرور ہو گی۔''

''تم مبہم سی باتیں کرتے ہو۔''

''پھر کیسی باتیں کروں۔''

''باتیں کھل کر ہونی چاہیے جیسے دو حقیقت پسند انسان آپس میں کرتے ہیں۔''

''میں خود حقیقی زندگی کا قائل ہوں۔ اسی لئے ذہی رشتوں پر جسمانی رشتوں کو ترجیح دیتا ہوں۔''

''ایک سوال پوچھوں۔''

''پوچھیے۔'' میں نے کہا۔

''برج سے تمہارا کیا تعلق ہے۔؟''

''ہم دوست ہیں۔''

''کیا میں اُس دوست کی امانت نہیں ہوں؟''

''برج نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا۔''

''پھر کیا کہا تھا۔؟''

''صرف شادی کی بات کی تھی۔''

''اگر میں..........!''

''ہاں ہاں کہیئے۔''

''اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں بھی جسمانی رشتوں کو ذہنی رشتوں پر ترجیح دوں اور پھر ایک دن میری شادی برج سے ہوتی ہے۔تب کیا ہوگا؟''

''ہوگا کیا؟...... کچھ بھی نہ ہوگا۔بس تمہارے گھر کا دروازہ میرے لئے ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گا۔لیکن پھر بھی زندگی کے کسی اُداس لمحے میں تمہیں کسی کا خیال آئے گا۔کوئی تمہاری یادوں کو جھنجھوڑ ڈالے گا۔ وہ میں ہوں گا.........صرف میں.......... جانے اُس وقت میں کہاں ہوں گا۔تم مجھے کہاں تلاش کروگی؟''

''کیا تم ایک لمحے کی مسرت کے لئے زندگی بھر کی دوستی قربان کرنا چاہتے ہو۔؟''

''میں نے کل کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں صرف آج کے

بارے میں سوچتا ہوں۔آج کے آخری لمحے کے بارے میں بات کر رہا ہوں
۔اُس لمحے کی آخری سیما۔آخری حد............"

"نادر۔!

زندگی کیا ہے چند لمحاتی لذتوں کا احساس!

رات کافی جھک آئی ہے۔

اُف میں کیا کروں۔نیند نہیں آتی۔

اور اگر نیند آگئی اور میں سو گیا پھر............؟!

بات نیلی کی نہیں۔کوئی بھی عورت خواہ کتنی ہی معزور کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی خود پسند کیوں نہ ہو۔وہ اپنے محبوب کی آغوش میں ہو یا کسی غیر مرد کے سینے سے لپٹی ہوئی، اُس کے بازوؤں میں جکڑی ہوئی ہو............اُس وقت بھلا اُس کی کیا حقیقت ہوتی ہے۔

اور نیلی۔!!

میں اپنے آپ کو کوئی نام نہ دے سکا۔نہ محبوب کا اور نہ ہی غیر مرد کا............میرا کوئی نام نہیں۔

میں جب نیلی کے کمرے سے باہر آیا۔رات کے تین بج چکے تھے۔اور راشد چلا گیا تھا۔رات سو رہی تھی۔میں پیدل ڈل کے کنارے چلتا رہا۔جھیل ڈل کے کنارے............کائنات بڑی خاموش تھی۔ہاؤس بوٹوں کی رنگین دنیا میں کوئی زندگی نہ تھی۔جھیل کے آس پاس نالوں میں بید کے پیڑوں کی قطاریں بھی بے حس تھیں۔اور ڈل کے پانیوں میں تیرتے ہوئے

باغ بھی جیسے سو چکے تھے۔ابدی نیند..........صرف ایک میں جاگ رہا تھا۔

برج ممبئی کے ہنگاموں میں گم ہو چکا تھا۔اور میں کشمیر کے ہنگامے اپنا چکا تھا۔

نیلی اور برج کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔صرف ایک دیو۔

..........کالا دیو۔ایک لمحے کے لئے نیلی کی زندگی میں آیا اور گھر بنانے کے سارے خواب مسمار کر گیا۔نوعمر تمنائیں اپنے آپ مر گئیں۔

وہ کالا دیو میں تھا۔!

میں نے مڑکر دیکھا..........اوبرائے پیلس کی ہوٹل کی عمارتیں خاموش تھیں اور ان عمارتوں میں ماضی کے سائے خاموش تھے۔ابدی نیند سو چکے تھے۔آگ کے شعلے بجھ چکے تھے۔صرف راکھ باقی تھی۔غلامی کی راکھ..........آزادی کے شعلے۔!

یہ کوئی بہادری نہیں کہ تم نے اپنے مکان کی سیڑھیوں پر سونا بچھا رکھا ہے اور گھر میں صندل کے دروازے اور کھڑکیاں لگا رکھی ہیں۔ یا اُس کی اُونچی بنیادیں سونے کی اینٹوں سے تعمیر کی ہیں۔ بہادری تو یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی تلوار سے کھیلنا سیکھو۔

یہ آزادی کی باتیں ہیں۔شاعر کشمیر آزاد کی آواز ہے۔

عوام ظلم، غربت، ناانصافی، پسماندگی اور جہالت کا شکار بنے ہوئے ہیں۔اور خود غرض لیڈر شان وشوکت سے رہتے ہیں۔!

یہ کشمیر ہے۔

بڑشاہ کا کشمیر.........للّ دید اور نور الدین ولیؒ کا کشمیر۔!

یہ میرا کشمیر ہے.........میرا گھر.........آزادی زندہ باد۔

رات اتنی تاریک کیوں ہے؟ یہ کیسا اندھیرا ہے؟

یہاں کوئی روشنی نہیں، کہیں نور نہیں.........اس اندھیرے میں، میں اپنی نیند کو کہاں تلاش کروں.........میں سونا چاہتا ہوں اور اتنی دیر سونا چاہتا ہوں کہ نیلی کو بھول جاؤں۔ صوفیہ اور انیتا کو فراموش کرسکوں اور وہ زلیخا.........پر نیند نہیں آتی۔

آزاد کہہ رہے ہیں

"تم ایک آفتاب ہو اپنا نور دنیا کو دکھلاؤ"

اور میں اُس نور کی تلاش میں آج پینا چاہتا ہوں،

پی پی کر بدمست ہونا چاہتا ہوں.........میرے پاس نئی شراب کے نئے برتن ہیں۔ پیالہ نیا ہے۔

.........لیکن ساقی.....؟!

کاش آج اوما میری ساقی ہوتی۔

کبھی کبھی شام ہوتے ہی کالے سیاہ بادل پھٹ جاتے ہیں اور صاف وشفاف بارش برسنے لگتی ہے۔ ایسی بارش میں بھیگ جانا جانے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔ جی میں آتا ہے ایسے ہی بھیگتا بھاگتا دور کسی جنگل میں جا بسوں اور شاید اُس ہرنی کو پاسکوں جو مجھ سے کھوگئی ہے۔

دوستو۔!

تم بے شک میرا مضحکہ اُڑاو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے ہی ایک ان دیکھے جنگل میں ایک بار وہ ہرنی مجھ سے کھو چکی ہے۔ اُس روز جنگل میں برق و باراں کا طوفان اُمڈ پڑا اور قد آور درختوں نے ہیبت ناک طریقے سے آپس میں سرگوشیاں کرنی شروع کر دیں اور اس کے بعد وہاں اس قدر گہرا اندھیرا چھا گیا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میری پیدائش سے اب تک تمام راتوں کی تاریکی میرے دل کے جنگل میں جا بسی ہو۔

دل کا جنگل۔

ویران ویران......!!

اور اب ہر برستی شام کو میں اُسے پانے کی آرزو میں ان جنگلوں میں گھومتا ہوں ....آج جب میں نے اپنی نظریں اُٹھا کر دیکھا، کوئی جنگل نہ تھا اور نہ کوئی ہرنی تھی......قمقموں کی تیز روشنی تھی۔ گہما گہمی تھی، ہنگامے تھے، زندگی اپنے شباب پر تھی اور میرے سامنے اوبرائے پیلس کا بار تھا جہاں اقبال اکیلا بیئر پی رہا تھا۔

برستی شام اور یخ آلود ٹھنڈی بیئر۔!

''بیئر پیو گے۔؟ اقبال نے پوچھا۔

''بیئر نہیں، وہسکی، لیکن ابھی ٹھہر کر اور یہاں نہیں۔''

''پھر۔''

''اندر، میرے کمرے میں'' دفعتاً میری زبان سے نکل گیا۔

تمہارا کمرہ۔؟''

"میرا مطلب ہے کہ کمرہ ۱۰۴ میں کوئی میرا منتظر ہے۔"

"میں بھی چلوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اُٹھو۔"

اقبال نے بیئر کا گلاس ایسے ہی رکھ دیا اور میرے ساتھ چل پڑا میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کمرہ کھلا ہی تھا۔

"Come in"

وہی آواز، وہی مٹھاس؟

میں نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے کے اندر آ گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں خوابوں کے جزیرے میں آ گیا ہوں۔ حالانکہ وہی کمرہ تھا۔ کمرے کی چیزیں ویسی ہی تھیں۔ کمرے کی سجاوٹ وہی تھی اور نیلی بھی وہی تھی.......... پر آج کی نیلی کل کی نیلی سے کچھ مختلف تھی۔ آج نیلی کی آنکھوں میں انتظار کا عکس نظر آ رہا تھا۔

"میں آپ ہی کی منتظر تھی۔!

"یہ میرے بھائی ہیں اور دوست بھی.......... اقبالؔ۔!

"اقبالؔ۔"

"ہاں اقبالؔ۔" البتہ میرا اقبالؔ شاعر نہیں، انجینئر ہے۔"

"میرے بڑے بھائی کا نام بھی اقبالؔ تھا۔"

"تھا۔؟.......... کیا مطلب۔؟"

"وہ Air Crash کی نذر ہو گیا۔

''اوہ..........سوری'' ....اقبالؔ نے کہا۔

میں نے اقبالؔ کا ہاتھ تھام لیا۔ نہ جانے کیسے میری نظروں کے سامنے آکاش کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہوئے ایک جہاز کی تصویر گھوم گئی اور جیسے میرے دیکھتے دیکھتے وہ جہاز بادلوں کی اوٹ میں گم ہوگا۔ اور اُن بادلوں میں آگ لگ گئی۔

میری گرفت میں زور آ گیا۔

''کیا بات ہے؟ اقبالؔ نے پوچھا۔

''ایر کریش''۔

اقبالؔ نے مسکراتے ہوئے کہا'' ان کے بھائی کا ہوا تھا۔''

میں نے اقبال کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نیلم نے کہا۔

''بیٹھئے نا، اقبالؔ بھائی۔''

بئیر آیا۔ گلاس لگ گئے، شراب اُنڈیل دی گئی اور اس کہانی کی دوسری نیم تاریک رات شروع ہوئی..........میں نے کہا نا کبھی کبھی سرشام ہی بادل پھٹ جاتے ہیں اور صاف وشفاف بارش برسنے لگتی ہے۔ بس نیلی بھی ایک بادل بن کر پھٹ گئی اور اُس کے سینے کی گہرائیوں سے اس کا دل بولنے لگا۔ صاف وشفاف باتیں۔ اُن باتوں میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کوئی تضاد نہ تھا۔

اس نے کہا..........''میں ہر شام شراب پیتی ہوں۔ شراب پینا کوئی پاپ نہیں۔ لیکن میری ایک کمزوری ہے، میں تنہا شراب نہیں پی سکتی۔

شراب ایک ایسی شئے ہے جو تنہائی نہیں چاہتی۔ حالاں کہ کبھی میں ان تنہائیوں سے پیار کرتی تھی۔''

''اور اب۔''میں نے پوچھا۔

''ابھی تو میمی کو ساتھی بنالیا ہے۔ میری بے زبان جنگلی بلی۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''میں شراب نہیں چھوڑ سکتی اور شراب پینے کے لئے ہر روز کسی نئے دوست، کسی نئی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔''

میں سونا چاہتا ہوں۔ لیکن نیلما کے یہ الفاظ، شراب ...... نئے دوست...... مجھے کہیں دور لے جانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اور مجھے ایک کہانی یاد آرہی ہے۔ نیلما کے یہ الفاظ اس کہانی میں خلط ملط ہورہے ہیں۔ کبھی کبھی میں بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی ہوں۔ جو معصوم ہوتی ہیں۔ یا گناہ آلود، میں نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں اپنے جسم کو دیکھتی ہوں اور لاتعلق انداز میں اپنے حسن کے بارے میں سوچتی ہوں۔ میری یہ حرکت میرے شہوانی جذبات کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اس سے میری جمالیاتی اور افلاطونی احساسات کو تسکین پہنچتی ہے۔ میری ان حرکات سے نرگیست جھلکتی ہے اور میں اپنے ہونٹ آئینہ کی ٹھنڈی سطح پر رکھ کر اپنے ہی عکس کا بوسہ لیتی ہوں......!

اقبالؔ تمہارے لئے نیا ہی سہی، مگر اس کا یہ روپ میرا جانا پہچانا ہے۔''میں نے کہا۔

''تم نے غلط سمجھا۔ میں چاہتی ہوں میرا ایک ہی ساتھی ہو جو میری تنہائیاں بانٹ لے۔''

''تب میمی کا کیا ہوگا۔؟''

''میں اُس کو چھوڑ دوں گی۔''

''اگر یہ تنہا بھٹک گئی تو............''میں نے کریدا۔

''تمہیں میمی کی بڑی فکر ہے اور میری......''

''میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں؟''

''تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔ میری شادی ہوسکتی ہے۔''

''کس سے؟''

''برج سے۔!''

''برج .... برج .... کم بخت پھر آیا اس کہانی میں۔ میں نے کل ہی اُسے مارڈالا تھا۔ کل رات ہی ممبئی کے ہنگاموں میں گم کردیا تھا۔ آج کیسے زندہ ہوگیا۔''

''کون برج؟''اقبال نے پوچھا۔

''برج یعنی پل''......میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''پل تو دو کناروں کو ملاتا ہے۔ ایک بہتی ندی کے دو کنارے ایک ہوجاتے ہیں۔''اقبال اب ایک انجینئر کی طرح سمجھانے لگا۔

نیلی اقبال کو دیکھے جارہی تھی۔ میں خاموش رہا۔

''کیا سوچنے لگے۔''

''کچھ بھی تو نہیں ......لیکن کچھ سوچ ہی رہا ہوں......کیا؟''

''بڑے بھائی بہک گئے ہیں۔'' اقبالؔ نے چوٹ کی۔

''ہاں میں بہک گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اتنی شراب نہیں پینی چاہیے کہ بہک جانا پڑے۔'' اقبالؔ نے پھر چوٹ کی۔

نیلی نے کہا.........اقبالؔ بھائی شراب پی کر بہکنا زندگی کا ایک خوبصورت پہلو ہے، تم کیا جانو۔''

سوچتے سوچتے میں اسی راہ پر چل پڑا۔ جس کے کئی موڑ ہیں۔ شانتی کے سائے کہیں ڈوب نہ جائیں۔ میں نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا، کئی چہرے ایک ساتھ میرے سامنے آ گئے۔ کئی گھر ایک ساتھ گھوم گئے،۔ راشدؔ کی ہٹ گھوم گئی، جہاں ایک خوبصورت کمرے میں ایک بے داغ بستر بچھا ہے۔ ممبئی کے ہنگاموں میں سمندر کے کنارے وہ فلیٹ گھوم گیا۔ جہاں برجؔ رہتا ہے اور جس کے ایک کمرے میں ریشمی بستر سجا ہوا ہے۔ شاہدؔہ کی خواب گاہ نگاہوں کے سامنے آ گئی کوثرؔ کا کمرہ.........کھردرا بستر.........اور یہاں بالکل میرے سامنے اوبرائے پیلس کے اسی کمرے میں ایک بستر نظر آ رہا ہے۔ گرم اور حرارت سے بھرپور.........!

اور نیناؔ شادی کرنا چاہتی ہے، ایک گھر کے لئے،۔ شادی دراصل ایک بستر ہے۔ نرم نرم ریشمی بستر۔ گھر دراصل ایک بستر ہے۔ گرم گرم گداز بستر...... اور اسی بستر کے لئے زندگی کے سارے ہنگامے جنم لیتے

ہیں۔ اسی بستر پر لوگوں کی تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اسی بستر پر دنیا کے برے اور اچھے لوگوں کا جنم ہوتا ہے۔ اور اسی بستر پر محبت کا آغاز ہوتا ہے اور نفرت کی انتہا۔؟!

گھر کی بات چلی نا۔ مجھے کوثر یاد آرہی ہے اور احسان کا گھر۔ اُس گھر کا ایک کمرہ کبھی میرے مصرف میں تھا۔ اب کوثر احسان کی بیوی ہے۔ اور میرا اُس گھر سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اُس گھر سے اور اُس گھر کے ایک مخصوص کمرے سے میری بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ اُنہیں کہاں دفنادوں، اُس کمرے میں تو میرے ماضی کی ایک طویل کہانی بکھری ہوئی ہے......

وہ کمرہ......نیلگوں سیمابی روشنی میں نہایا ہوا کمرہ۔

گلابی رنگ کی آرام دہ کرسیاں، جن میں دائیں طرف کی کرسی پر میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور اُس کی پہلو والی کرسی پر کوثر میرے زانوں پر سر رکھے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہتی تھی۔ صندل کی بنائی ہوئی خوشنما میز جس کے سامنے بیٹھ کر اُس نے کئی بار اپنے ریشمی بالوں کو سنوارا ہے۔ کونے میں کھڑی گوڈریج کی وہ الماری اب بھی مرکری لائٹ میں جگمگا رہی ہوگی۔ جس کے نکل کیے ہینڈل پر اُس کے ہاتھوں کا لمس ہے۔ مینٹل پیس پر رکھا ہوا وہ روغنی گلدان اور اُس میں رکھے ہوئے پھول شاید اب مرجھا چکے ہوں گے۔ اُن دنوں میں خود اپنے ہاتھوں سے گلدان سجاتا تھا۔ ہاں سنہرے رنگ کا وہ پن تو ہوگا۔ مگر وہ لیٹر پیڈ نہیں جس کے ڈسٹ کور پر کوثر نے میرا نام لکھا تھا۔ اب کوئی اور لیٹر پیڈ ہوگا اور اُس کے ڈسٹ کور پر کوئی اور نام۔

......ہاں احسان کا نام...... آنگن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب اخروٹ کی لکڑی کا پالش کیا ہوا خوب صورت پلنگ اور اُس پر بچھا ہو پھول دار ساٹن کا معطر بستر۔

......کتنی بار کوثر سوئی تھی اُس بستر پر۔ شاید اب بھی اُس کے دودھیا جسم کی گرمی اور نرمی رچی ہوگی اُس بستر میں .... وہی سب کچھ ہوگا۔ صرف میں نہیں...... میں؟!

ایک دن کوثر میرے ساتھ اس گھر میں اجنبی بن کر آئی اور ایک روز میں اُس گھر سے اجنبی بن کر نکلا۔ کتنی بڑی بات ہے۔ کتنی دیر لگتی ہے اجنبی بننے میں، اپنا بننے میں...... اپنا اپنا گھر۔ اپنے اپنے لوگ......!!

''نیکی، ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں۔!''

''کشمیر میں تمہیں کیا اچھا لگا۔؟''

''یہاں کے رنگ...... رنگ جو کبھی تیکھے ہوتے ہیں اور کبھی شوخ۔ کبھی بھیگے ہوئے، دھند میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں،۔''

''اور یہاں کے لوگ۔''

''یہاں آنے سے پہلے کتنے لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں یہاں آ کر کشمیریوں کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں، یہ لوگ بُرے ہیں۔''

''کچھ لوگ تو ملے ہوں گے؟''

''ہاں''

''بھلا کون سے لوگ۔؟''

''میں بتانا نہیں چاہتی۔!''

''میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ پھر کیا ہوا۔؟

''لوگ بُرے نہیں ہیں۔ اور پھر سبھی جگہ لوگ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔لوگوں میں اپنی کمزوریاں اور اچھائیاں ہوتی ہیں۔''

''میرے بارے میں کیا رائے قائم کرلی ہے؟''

''تم بُرے نہیں ہو۔''

''کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''تم بے حد جذباتی ہو، ہر بات دل تک لے جاتے ہو۔''

''کیا مجھے اپنے جذبات پر کوئی ادھیکار نہیں۔ اپنے دل پر کوئی حق نہیں۔ کیا میرا دل کسی کیلئے نہیں دھڑک سکتا۔ کیا کسی کو پانے کے لئے میرے دل میں کوئی خواہش پیدا نہیں ہوسکتی؟''

''لیکن اگر یہی دل کسی اور کی زندگی بنانے کیلئے دھڑکے تو میں ساری زندگی کے لئے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ نگی۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''میرا گھر بنے گا۔!''

''اور اس گھر میں کیا ہوگا؟''

''میرا پیار...... میرے بچے...... میری......''

''نا...... کچھ بھی نہ ہوگا؟ یہ سب پانے کے لئے ایک بستر کی

ضرورت پڑتی ہے۔ گرم اور گداز بستر، اور وہ بستر کمرے میں بھی ہے۔ وہ دیکھو۔"

"لیکن میرا ساتھی تو ہوگا میرے ساتھ۔"

"ساتھی کا کیا ہے، میں بھی بن سکتا ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" اقبال تقریباً چیخ پڑا۔

"اقبال۔" میں نے بھی اسی لہجے میں کہا...... "کچھ باتیں سننے کیلئے ہوتی ہیں، کچھ سوچنے کی اور کہنے کی...... تم میری باتیں سنو۔ اُن پر سوچو، پر کچھ بھی نہ کہو۔"

"تم ہمیشہ اپنی چکنی چکنی باتوں سے محفل کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہو۔"

"شاید یہ میری کمزوری ہو اور شاید میں اسی لئے بہک جاتا ہوں۔" اقبال نے نیلی کو مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ کا بھائی مر اتھانا"۔

"ہاں۔!"

"کیا نام تھا اُن کا۔؟"

"تمہارا ہم نام تھا...... اقبال۔"!

"کیا میں اُس کی جگہ لے سکتا ہوں۔"

"تم۔؟"

"ہاں!"

نیلی کھڑی ہوگئی۔ اقبال بھی کھڑا ہوا۔ دونوں کے ہاتھوں

میں گلاس تھے،۔ میں بیٹھا رہا۔ سب کچھ دیکھتا رہا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے...... اس ٹکراؤ نے ایک رشتے کو جنم دیا۔ جب دونوں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ میں نے ایک بار پھر نرم گرم ریشمی بستر کی جانب دیکھا۔

محبت۔!

''اے عزیزو!.......... آؤ، ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں، کیونکہ محبت خدا کی دین ہے۔ اور جو کوئی محبت رکھتا ہے۔ وہ خدا سے محبت رکھتا ہے۔''

(انجیل مقدس......)

ایسی تاریکی ،ایسا اندھیرا، جس میں سب کچھ کھو گیا ۔ قبر کا سا اندھیرا، قبر کی سی گھٹن ...... یہ گھٹن کہاں نہیں ۔قبر کی تہہ میں، جھیل کی گہرائیوں میں اور یہ گھٹن تو یہاں میرے کشمیر میں کئی سالوں سے چلی آ رہی ہے...... ہاں جب کشمیر آزاد ہوا تھا۔ جب کشمیریوں نے آزادی کی جنگ جیتی تھی۔ اس آزادی نے کیا دیا...... تاریکیاں، گھٹن ، بے بسی اور مجبوری !!!''

اُن کہی داستان ایک نظر کہہ گئی۔

اور اندھیرے سے بھر پور دوسری رات کی کہانی ختم ہو گئی۔ پر آج میں اکیلا نہ تھا۔ میرے ساتھ کئی سائے تھے۔ کوئی راشدؔ کے روپ میں، کوئی برجؔ کی صورت میں اور کوئی اقبالؔ کی شکل میں ....! 'میرا اپنا کوئی سایہ نہ تھا۔ کیونکہ ان اندھیروں میں اپنا سایہ نظر نہیں آتا اور کبھی کبھی تو میں دن کے اُجالوں میں بھی اپنے سائے سے ڈرتا ہوں.. ... مجھے اندھیرے پسند ہیں۔

آؤ سو جائیں۔ نیند نہیں آتی!''

اس سے پہلے کہ تیسری ملاقات یا اس کہانی کی تیسری رات کی بات کروں۔ میں اپنے ناسور کو رسنے دینا چاہتا ہوں کیونکہ تیسری رات کو بنتی نے نیلی سے میرے بارے میں کچھ ایسی باتیں کیں کہ میرے پرانے ناسور رسنے لگے۔ میرے پرانے زخم کھل گئے............ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں نے زندگی میں ایک بار بڑی شدت کے ساتھ شاہدہ سے محبت کی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اُن دنوں میں محبت کو اثاثہ سمجھتا تھا۔ اُن دنوں محبت میرے لئے محبت تھی ،زندگی تھی۔ جیون تھی، ہاں یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں شاہدہ کے ساتھ برفانی چوٹیوں پر پورے چاند کی رقصاں چاندنی کو دیکھ سکتا تھا۔ نیلگوں وسعتوں میں لاتعداد ستاروں کی تھرک محسوس کر سکتا تھا۔ اُن دنوں ٹمٹماتے ستارے ہمارے محبت کی داستان میں شریک تھے......اور ایک دن اسی شاہدہ نے کسی اور کو اپنا لیا اور بھری محفل میں مجھ سے کہا......''میں نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ اس محفل میں ریاض بھی تھا۔ اور شاہدہ کا بھائی الطاف بھی...... ،میرے لڑکپن کا دوست جو میرے اور شاہدہ کی محبت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہدہ کی شادی مجھ سے ہو۔ وہ دوستی کو رشتہ داری میں بدلنا چاہتا تھا۔ اور اُس رشتہ داری کو ابدیت بخشنا چاہتا تھا۔

میرے ساری تمنائیں مر گئیں۔ زندگی دم توڑنے لگی۔ اور میں بہت دور تک حسرتوں اور محرومیوں کی لاش اپنے سینے کے مدفن میں دبائے زندگی سے نباہ کرتا رہا۔ پہلی محبت تھی دھندلکوں میں کھو گئی۔ میں

نے زندگی کو اُسی ڈگر پر ڈال دیا جو موت کی سمت بڑھتی ہیں۔

کیسی باتیں ہیں۔ کیسے حالات ہیں اور وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بدلے ہوئے حالات میں لڑکپن کی گونگی محبت جب اپنی بھرپور جوانی میں بدل جاتی ہے تو اُسے زبان مل جاتی ہے۔ سوچ مل جاتی ہے۔ ایک مکان کی سوچ، گھر گرہست کی سوچ، باعزت زندگی کی سوچ، بس مرد اور عورت کی زندگی میں اتنا سا فرق ہے۔ مرد کی محبت ہمیشہ گونگی رہتی ہے، بولتی ہے نہ سوچتی ہے۔ لیکن عورت کی محبت......مکان، کار، روپیہ، عزت اور..........؟!

کتنے ہی لوگ آسمان کی طرف تکتے تکتے مایوس ہو چکے ہیں۔ کاش آسمان ایک خزانہ ہوتا اور کسی دن اس خزانے کا منہ اپنے آپ کھل جاتا۔ آسمان پھٹ پڑتا اور یہ خزانہ، یہ ساری دولت لوگوں میں یکساں تقسیم ہوتی......پھر شاید محبت نہیں روتی۔

میں بھی کب سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ کتنی بڑی دنیا ہے یہ اور اس بڑی دنیا میں میرے لئے کچھ بھی نہیں۔ اسی لئے میں سونا چاہتا ہوں۔ میں اُس سانپ کو بھی سلانا چاہتا ہوں جو میری چھاتی پر آہستہ آہستہ رینگ رہا ہے۔ آج ایسا نہ سوچو، دل کی دیواروں کو اور اُونچا کرلو، ان پر آہنی زنجیریں لٹکا دو۔ تاکہ یہ سانپ باہر نہ آئے۔ اگر یہ باہر آنے میں کامیاب ہو گیا، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

"بھلا کیا ہوگا؟"

"میں شاہدہ کو اغوا کرلوں گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"دل کے آنگن کا پھول مرجھا جائے گا۔"

شاہدہ اور ریاض کی شادی طے ہوئی۔ اور محبت نام کی شئے سے میرا اعتقاد اُٹھ گیا۔ محبت کو میں نے ایک بستر کے روپ میں دیکھا، بستر جتنا نرم ہو، ملائم ہو، ریشمی ہو، گداز ہو، عورت کے لئے کشش رکھتا ہے۔ جب میں یہ فلسفہ سمجھ پایا۔ میں نے اپنے اندر کے انسان کو سُلا کر نیم وحشی حیوان کو جگایا اور میلی کچیلی اور گندی گلیوں میں گندے اور میلے کچیلے بستروں میں کھو گیا، اور کھویا ہی رہا۔ اس زندگی میں اگرچہ بڑا ہنگامہ ہے۔ بڑا ہی جوش ہے، لیکن کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا۔ سبھی کی شکلیں ایک جیسی ہیں۔ دکھ درد، اور پریشانیاں ایک سی ہیں۔ لیکن ایک بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، اس کے بعد بھی میں نے کبھی کبھی اپنی تنہائی کے زہریلے اور کربناک لمحوں میں ایک شبنمی لمس کا انتظار کیا۔ اُس سمے میں شاہدہ کو اپنے قریب محسوس کرتا اور پھر سوچتے سوچتے، دیکھتے دیکھتے ایک قیمتی بستر سامنے آجاتا...... شاہدہ ریاض کی آغوش میں، اور میں بے کل سا ہو جاتا۔ بے قرار سا ہو جاتا۔ نیلما کو دیکھ کر مجھے اُسی شبنمی اُسی نرگسی لمس کا احساس ہوا۔

بنسی نے کہا۔" آپ کی شادی برج سے نہیں ہو سکتی۔"

نیلی نے پوچھا...... "کیوں۔؟"

"کیا برج سے آپ نے شادی کی بات کی تھی۔؟"

"مجھ سے نہیں، لیکن آپ کے دوست کہہ چکے ہیں۔

برج کوان پر اعتبار ہے اور مجھے بھی۔"

"آپ نے کیسے ان پر اعتبار کیا۔"

"میں خود بھی نہیں جانتی۔"

"میں جانتا ہوں......ان کا چہرہ دیکھ کر۔ بڑا شریف سا لگتا ہے نا۔ دراصل یہ چہرہ بناوٹی ہے، مصنوعی ہے۔ اس کا اصلہ چہرہ بڑا مکروہ ہے۔ اس آدمی پر بھروسہ مت کیجئے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ آدمی مر چکا ہے، آپ جو دیکھ رہی ہیں نا، یہ اُس کی چلتی پھرتی لاش ہے اور یہ لاش بن کر، عجیب عجیب سی کہانیاں گھڑ کر دوسرے کو بھی بے موت مارنا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ برج آپ سے شادی کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ البتہ اُس آدمی نے آپ کے قریب آنے کے لئے شادی کرنے کی ایک کہانی سوچی اور آپ کو سنائی......شادی کی کہانی سب کو اچھی لگتی ہے۔ جو غیر شادی شدہ ہیں وہ شای کرنا چاہتے ہیں اور جن کی شادی ہو چکی ہے وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک پرانا اُصول ہے اور آپ بھی شادی کی کہانی سن کر نادر کی باتوں میں آگئیں اور اب...... ......اب نیلما دیوی یہ ہر روز، ہر شام، ہر رات گئے یہاں آکر شراب پیتا ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ بس اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے۔"

بنسی ایک ہی سانس میں حسب معمول ایک بھر پور لکچر دے گیا۔

"میں نے کہا۔ "بنسی سپرو یہ کافی ہاؤس نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہا۔

''کون سا مقصد مسٹر بنسی''، نیلی نے حیرانگی سے پوچھا۔

''آپ کو پانے کا مقصد۔''

''یہ مجھے پا چکا ہے۔''

''کس روپ میں۔''

''ایک دوست کے روپ میں۔''

''دوست ......دوست .... یہ کسی بھی دوستی میں یقین نہیں رکھتا۔ کسی رشتے پر اعتبار نہیں کرتا۔ کسی بھی عمر کا قائل نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک ہی رشتہ ہے، ایک ہی عمر ہے اور ایک ہی نام ہے..........عورت اور مرد۔''

''عورت اور مرد کا رشتہ۔!''

دفعتاً میمی چلائی۔ اور گھبرا کر نیلی کی گود میں بھاگ گئی، میں نے کہا۔

''میمی کو شاید پیاس لگی ہے۔''

''میمی کی پیاس تو پانی سے بجھ سکتی ہے۔ لیکن تمہاری پیاس کا کیا ہوگا۔؟''۔ بنسی نے مجھ سے سوال کیا۔

''میری پیاس تمہارے خون سے بھی نہیں بجھ سکتی''۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خاموشی اختیار کرے۔

''کاش ایسا ہوتا تو مجھے کئی جنموں کا سکون ایک ساتھ میسر ہوتا۔'' وہ حسب معمول باتیں کرنے اور لڑنے کے مُوڈ میں تھا۔

''میں نے نرم لہجہ اپنایا۔''اپنی بلند شخصیت کی باتیں مت کرو یار۔''

''میں کیا ہوں کہاں کھڑا ہوں یہ تم بہتر جانتے ہو۔لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تم اس لڑکی کی زندگی تباہ کرو۔''

''جو خود تباہ ہو چکا ہو۔وہ دوسروں کو کیا تباہ کر سکتا ہے۔''

''تو چلیں۔''

''چلو۔''

نیلی نے کہا''نادر جانے سے پہلے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''کہو۔''

''اس سمے مجھے لگ رہا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''ہاں دیکھا ہے۔!''

''کہاں؟''

''پری محل میں جب میں داراشکوہ تھا اور تم ایک برفانی پری۔تم نے میرے لئے ہی رقص کیا تھا۔''

''میں اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں۔حال کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''اس زندگی میں بھی دیکھا ہوگا۔''

''بھلا کہاں؟''

''ہوسکتا ہے کہ تم نے مجھے کسی کھیل کے میدان میں دیکھا ہوگا۔کسی

سینما گھر میں، کسی دکان میں خریداری کرتے ہوئے یا کہیں بطخوں کا شکار کرتے ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ تم نے کسی ہوائی سفر کے دوران مجھے اپنے قریب پایا ہو...... کسی ہوٹل میں، کسی بک شاپ میں۔لیکن نیلم جی صحیح بات تو یہ ہے کہ تم نے مجھے پہلی بار برج کے ساتھ دیکھا اور اُسی کے کمرے میں۔''

''بنسی ہنس پڑا۔

''کیا ہوا۔؟''میں نے پوچھا۔

''کیا نفیس کہانی بنائی ہے۔''

''کہانی۔؟ نیلی نے پوچھا۔

بہر حال نیلما دیوی، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر وہی الفاظ دہرا رہا ہوں۔ یہ آدمی جو آپ کے سامنے ہے نادر کی شکل وصورت میں کھڑا باتیں کر رہا ہے،۔مر چکا ہے.......... ہاں مر چکا ہے۔''

نیلی نے میری طرف دیکھا اور بغیر کہے کمرے سے باہر آیا۔ ہاں ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''کل ضرور آنا، پر اپنے دوست کو تکلیف نہ دینا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں اکثر اپنے من سے باتیں کرتا ہوں، کئی بار میں نے اپنے من سے پوچھا.......... جب کبھی شاہدہ کو اُس کی سکھیوں نے میرے بارے میں کچھ پوچھا ہوگا تو اُس نے کیا جواب دیا ہوگا؟''

''پوچھا ہوگا.......... تیرے ساجن کیوں نہیں آئے۔؟''

''کیا جواب دیا ہوگا؟''

''پھر سکھیوں نے کیا کیا پوچھا

''خاموشی..........!!

جس دن کوثر کی شادی احسان کے ساتھ ہوئی، میں بھی موجود تھا۔ یہ شادی احسان کے گھر میں ہوئی، کوثر کی جانب سے شادی میں کوئی شریک نہ ہوا۔ صرف اُس کی ایک سہیلی تھی۔ گھونگریالے بالوں والی ایک لڑکی جس کی آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی تھیں.......... سبھی احسان کی طرف سے تھے۔ پال، اقبال، بنسی، ہنڈو، بشیر اور موہن کے علاوہ بھی کچھ یار دوست تھے۔ میں اُسی کمرے میں بیٹھا تھا، جہاں کوثر ایک بار اجنبی بن کر میرے ساتھ آئی تھی اور جہاں سے میں ایک بار اجنبی بن کر نکلا تھا۔ اُس کمرے کی سب چیزیں اُسی انداز میں سجی ہوئی تھیں جیسے کہ میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہاں ایک چیز ضرور نئی تھی۔ پہلے اخروٹ کے پلنگ پر ساٹن کا بستر بچھا تھا۔ اب اُس پر ایک نیا بستر بچھا تھا۔ بے حد کھردرا..... جانے کیوں۔؟''

اور اُس نئے بستر پر کوئی شکن نہ تھی۔!

اُس رات میں نے پہلی بار خودکشی کے بارے میں سوچا تھا۔

باہر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ رات شاید کافی جھک آئی ہے۔ ڈل کے بے کراں وسعتیں سامنے نظر آرہی ہیں۔ کتنی بڑی جھیل ہے۔ ڈل جھیل، صدیوں پرانی، اپنے سینے میں صدیوں کی کہانیاں چھپائے...... میرے زندگی بھی ڈل جھیل کی ان بل کھاتی لہروں سے کتنی ملتی جلتی ہے۔

چند لمحوں کی قربت اور پھر جیون بھر کے لئے فراق۔؟

میں نے سوچا، اگر آج کی رات میں ڈل جھیل کی گہرائیوں میں کھو جاؤں تو ایک اور کہانی کا اضافہ ہوگا.......... پر میرے خود کشی کی کہانی کون لکھے گا۔ میری موت پر کون آنسو بہائے گا۔ اُس آنسو کی کہانی کون لکھے گا۔ میرے اس ادھورے افسانے کو کون مکمل کرے گا۔؟

بنسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا.......... ایک عورت کا جسم پانے کیلئے ایک گھر کا تصور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

"تم کس کے جسم کی باتیں کرر ہے ہو۔؟"

"نیلما اور کون۔!"

"میں اُسے پا چکا ہوں۔"

"کس روپ میں۔؟"

"بقول تمہارے میرے لئے روپ صرف جسم ہے۔"

"پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟"

"بس ایک کہانی۔"

"اور اس کا انجام۔؟"

"میں نے کبھی انجام کے بارے میں نہیں سوچا۔ اگر سوچا ہوتا تو آج شاہدہ میری بیوی ہوتی۔"

"تم صوفیہ کو کیوں بھول جانے کی کوشش کرتے ہو۔؟"

"صوفیہ ان سب عورتوں سے بڑھ کر ہے......

صوفیہ کے لئے میرے دل میں جو احترام ہے، جو محبت ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اور میں صوفیہ کو شاہدہ اور نیلما کے درمیان لانا بھی نہیں چاہتا۔''

''یہ بھی سہی لیکن ایک شاہدہ کے لئے تم کتنی اور شاہداؤں کو تباہ کرتے رہو گے۔؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے صرف مسکرادیا۔ بنسی میری مسکراہٹ دیکھ بھی نہ سکا۔ ہم دونوں دوش بدوش ڈل کا کنارہ طے کرتے رہے...... خاموش خاموش...... صرف ہمارے قدموں کی دبی دبی سے آوازیں تھیں۔

دفعتاً ہم چونک پڑے۔

پو پھٹ رہی تھی۔

شادی کے بعد شاہدہ کو میں نے صرف ایک رات دیکھا۔ سردی سے کپکپاتی رات کہرے کی دبیز چادریں پھیلائے اُتر آئی تھی۔ برف کے طوفان نے کہرے کے ملگجے اندھیرے کو اور بھی گہرا کردیا تھا۔ باہر برف کے موٹے موٹے سپید سپید اُڑتے ہوئے گالے زمین پر گر کو منجمد تہہ میں بدل رہے تھے اور اندر نرسنگ ہوم کے ایک کمرے میں شاہدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے شبنمی قطرے بھیگے ہوئے شفق آلود گالوں سے بہہ رہے تھے۔ شاہدہ اکیلی نہ تھی۔ ریاض بھی تھا۔ کئی اور لوگ تھے۔ اُن لوگوں میں، میں بھی تھا...... بس ایک لمحہ بدلتے ہی اپنے غیر اور غیر اپنے بن جاتے

ہیں۔ کبھی میں بھی اپنا تھا۔ اوراب غیر......!!

سامنے لوہے کے پلنگ پر الطاف بے ہوش پڑا تھا...... الطاف...... شاہدہ کا بھائی اور میرے بیتے دنوں کا دوست! وہ ایک کار کے حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہوش میں تھا۔ اوراب بے ہوش۔ ساری دنیا سے انجان اور بے خبر، اپنی زندگی سے بے خبر۔ اُس کے لئے نہ کوئی غیر تھا اور نہ کوئی اپنا۔ یہ بے ہوشی بھی کیا شئے ہے۔ ہر تضاد کو مٹا دیتی ہے۔

زندگی ایک المیہ ہے، ایک روگ؟!

میں رونا چاہتا ہوں۔ میرے آنسو بس چھلکنے کو ہیں۔ میرا دل اپنی ہی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ آنکھیں دھندلائی جارہی ہیں۔ اور اس اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا...... اپنا سایہ تک نہیں۔

آنسو تھم چکے ہیں۔

شاہدہ کے رونے کی دبی دبی سسکیاں بند ہو گئی ہیں اوراب دبی دبی سی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں۔

میں اپنی آنکھیں کھول رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

شاہدہ ریاض کے قریب آ گئی ہے۔

''تم گھر چلو۔ میں ابھی ٹھہر کر آؤں گی۔''

''الطاف ابھی بے ہوش ہے۔ ٹھہر کر جاؤں گا اور پھر گھر میں اکیلا کروں گا بھی کیا۔؟''

''بنٹی رو رہی ہوگی۔''

''اماں ہے گھر میں۔''

''نہیں وہ کہیں چلی گئی ہے۔ بنٹی کے دودھ پینے کا وقت ہو گیا ہے۔ دایہ سے کہہ دینا وہ پلا دے گی۔''

''اچھا میں چلا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''الطاف کے ہوش میں آتے ہی مجھے فون کرنا۔''

میرے کانوں سے ریاضؔ کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نرسنگ ہوم کی سیڑھیوں سے اُتر کر گیٹ سے باہر جا رہا ہے۔

میں کمرے سے برآمدے میں آ گیا ہوں۔

برآمدے میں ڈاکٹر محمودؔ کھڑا ہے۔

''ہیلو ڈاکٹر۔''

''ہیلو نادرؔ۔'' بڑی مدت کے بعد نظر آئے۔''

''اور وہ بھی تمہارے نرسنگ ہوم میں۔''

ڈاکٹر مسکرا رہا ہے۔ How is ZULAIKH"

''میں کیا جانوں۔''

''کیوں لندن سے اُس کا کوئی خط نہیں آیا۔''

میں بات ٹال دیتا ہوں...... ......''الطاف کی یہ حالت

ڈاکٹر..........."

ڈاکٹر میری بات اَن سنی کر دیتا ہے۔ بے ہوشی کا دور ابھی ختم ہو جائے گا۔ اگر چہ چوٹ شدید آئی ہے۔ لیکن ڈر کی کوئی بات نہیں۔ بس چند دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں خاموش ہوں ڈاکٹر مجھ سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

"کبھی زلیخا کو خط لکھنے کا ارادہ ہو تو میرا اسلام لکھ دینا۔"

ڈاکٹر محمود اب سیڑھیوں سے اُتر رہا ہے۔

میں برآمدے میں کھڑا ہوں۔

کوئی آواز نہیں..........!!!

" I ask of the, beloved night-- swift be thine approaching flight, come soon- soon."(Shelly)

"آپ کیسے ہیں۔؟"

شاہدہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں خاموش ہوں۔ میں اپنے دل سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے دل سے پوچھنا چاہتا ہوں۔؟

"کیسے ہو۔؟"

پر یہ کیا کروں؟ شاہدہ جو سامنے ہے۔ شاہدہ اور........... دونوں کے درمیان فاصلہ ضرور ہے۔ لیکن کوئی فرق نہیں۔

"آپ کیسی ہیں؟" میں پوچھتا ہوں۔

"ٹھیک ہوں۔"

(خاموشی)

''ان دنوں کیا کرتے ہو۔ کہاں رہتے ہو؟'

''بڑا الجھا ہوا سوال ہے۔''

''نہیں تو۔''

''آپ کے لئے نہ سہی میرے لئے تو ہے۔''

''ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں؟''

''کہیے۔!''

''دوسروں کو خوشی دے کر ہم اپنا غم بھول جاتے ہیں۔''

''خوشی اور دکھ............ کس کی بات کر رہی ہیں آپ۔؟''

''تمہاری اور اپنی مجھے خوشی دے کر کیا تم اپنا غم نہیں بھول سکتے۔؟''

''مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔''

''تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔''

''شاید بتا رہی ہوں۔''

''یہ ویرانیاں بھی بہاروں......''

میں بات کاٹ دیتا ہوں......'' آپ بہاروں کی خواہاں ہیں اور میں ویرانیوں کا۔ بہاروں کو چاہنے والا، ویرانیوں سے کیسے نباہ کرسکتا ہے۔ چھوٹا سا فاصلہ ہے دونوں کے درمیان۔ اپنی اپنی نظر ہے اور اپنی اپنی سوچ کا فرق۔''

میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے آہستہ آہستہ برآمدے کو طے کر کے سیڑھیوں سے اُتر رہا ہوں اور اب نرسنگ ہوم کے گیٹ سے باہر جا رہا ہوں۔ ابھی ایسے ہی ریاضؔ بھی کچھ دیر پہلے گیٹ سے باہر گیا تھا۔ بنٹیؔ کو دودھ پلانے کے لئے۔ جانے بنٹی کو واقعی دودھ پلانے کے سمے آ گیا تھا یا ریاضؔ کو نرسنگ ہوم سے بھجوانے کا بہانہ.......... پر مجھے کیا...... نیلماؔ ؟!۔

میں شاہدہؔ کو کیسے کہتا کہ مرد کی پہلی محبت کا ساتھ چھوٹ تو سکتا ہے لیکن رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔؟

کوئی خودکشی کی طرف چل دیا۔

اُداسی کی محنت ٹھکانے لگی۔

دوسرے دن کی بات ہے۔ راشدؔ اپنی فائلوں میں کھویا ہوا تھا اور میں لداخ کے لوک گیتوں کے بارے میں ایک مضمون لکھ رہا تھا...... میں لکھ رہا تھا کہ:۔

مقامی حالات اور گرد و پیش نے لداخیوں کے عشق کو بھی مخصوص رنگ و روپ بخشا ہے۔ معشوق کا دل پتھر کے بجائے گلیشیر ہے۔ ملاخط ہو، لداخ کے ایک رومانی گیت کا بند۔''

تمہارا دل ایک گلیشیر
یہ اگر ایسے ہی رہا، اور بدلنے نہ پایا۔
میرا دل سورج اور چاند
پرانی ریت ہے کہ سورج اور چاند گلیشیر پر چمکتے ہیں''۔

فائلوں کے ڈھیر تلے راشد نے سر اُٹھا کر دیکھا......''تمہیں ہو کیا گیا ہے آج۔؟''

''کیوں......؟''

''بے حد اُداس ہو۔صبح سے کچھ بولے نہیں۔''

''تم ذرا فائلوں میں کھو گئے تھے نا۔''

''یہ تو روز کا معمول ہے۔البتہ آج تم موڈ میں نہیں ہو۔''

''میں لکھ رہا تھا۔''

''کیا۔؟''

''لداخ کے لوک گیت۔''

''ملا کچھ ان گیتوں میں۔؟''

''ہاں پتھر اور گلیشیر۔''

''بس۔؟''

''اور کیا ہونا چاہیے۔؟''

''لداخ میں نیلم بھی ہوتے ہیں۔''

''نیلم..........ہوتے ہوں گے۔؟''

''اور تمہاری نیلما کا کیا حال ہے۔؟''

''پتھر اور گلیشیر کے درمیان لٹک گئی ہے۔''

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔راشد نے ریسور اُٹھایا۔بات کی۔

میں نے پوچھا۔''کوئی خاص بات۔؟''

''نہیں تو۔کوئی منسٹر آ رہے ہیں دلی سے۔اُن کی ہی بات تھی۔''

پھر راشد نے کئی فون کیئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔چار بج چکے تھے۔ میں نے اپنا مضمون ادھورا ہی چھوڑا، اور دفتر سے نکل پڑا۔گھومتے گھومتے لا بیلا کی جانب چل پڑا۔ پال تنہا پی رہا تھا۔میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔گلاس تھامے اُس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔میں حیران ہو گیا۔

''آج اتنی جلدی۔؟''

''وجہ ہے۔''

''بھلا میں بھی جانوں۔؟''

آج اس دھرتی پر خون بہا ہے۔''

میں نے کہا............''خون کیا ہے۔کئی بار بہا ہے اور پھر تم نے خود ہی کہا تھا۔خون کا کوئی جغرافیہ نہیں ہوتا۔''

''اسی لئے تو رو رہا ہوں اور پی رہا ہوں۔آج کچھ لوگوں نے خون کا جغرافیہ دریافت کر لیا ہے۔تم کیا پیو گے۔؟''

''کیا پیوں۔؟''

''بیئر یا وہسکی۔''

''نہیں۔''

''آنسو۔''

''کس کے۔؟''

''میرے۔''

''نہیں پی سکتا۔''

''پھر کیوں آئے یہاں۔؟''

''کہیں اور جانا چاہتا تھا، اس طرف چلا آیا۔''

''کہاں۔؟''

''کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔''

''کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔''

''آج آزمانا چاہتا ہوں۔''

''پال تم کیسے کرو گے میرا انتظار۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا۔ کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔''

''میں کر لوں گا۔''

''آزما لوں آج۔''

''شاید پہلے بھی آزما چکے ہو۔''

''اب تمہارے پاس سرکاری کوٹھی ہے۔ اور تم بڑے آدمی بن گئے۔''

''مکان بدلنے سے دل نہیں بدلتے۔''

''اور بڑا آدمی۔؟''

''بڑے مکان میں رہنے سے آدمی بڑا نہیں ہوتا۔''

''پھر بھی۔''

"Will you shutup man"

میں خاموش ہوگیا۔ یہ پاؔل بھی عجیب آدمی ہے۔ کسی زمانے میں ہم دونوں ایک ہی محلے کی نیم تاریک گلی میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ کیسے دن تھے وہ۔ کیسی زندگی تھی وہ۔ ایک روز پاؔل وہ گلی چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک خوبصورت سی دومنزلہ سرکاری کوٹھی میں جابسا۔ اُس دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ اور میں اس کا سامان، اُس کی کتابیں، اس کے کپڑے صندوقوں میں رکھواتا گیا۔ اُسے یہ محلّہ گلی چھوڑ کر دکھ ہو رہا تھا۔ اُس کی بیوی خوش تھی کہ اب گندے اور کیچڑ سے بھرپور محلے سے چھٹکارا مل گیا۔ اُس کی بچیاں اُداس تھیں کہ وہ اپنی سکھیوں سے دور ہو رہی ہیں۔

پاؔل اندر ہی اندر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اُس گلی نے بچپن سے لے کر جوانی کی آخری حدوں تک اُس کی دیکھ بھال کی تھی۔ اور اب ...... اب بھی کبھی کبھی رات کے کسی ان دیکھے لمحے میں، اُس کے قدموں کی آہٹ گلی کے اندھیروں کو چیر کر میرے کانوں میں ٹکراتی ہے۔ میں کھڑکی کھول دیتا ہوں۔ کوئی آواز نہیں ۔ابدی اندھیرا .... میں اور میرے من کا اندھیرا..........!!

یہ میرا محلّہ ہے۔

اور یہ میرا شہر ہے، شہر سرینگر، جہلم کے کناروں پر آباد، جسے مغل بادشاہوں کے سپنوں ایسے ہاتھوں نے سجایا ہے۔ ہری بھری شاداب دھرتی۔ بھانت بھانت کے لوگوں کا شہر۔ شہر کے اردگرد پھیلے ہوئے پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں۔ وہ پہاڑ جو آگے پھیل کر ایسی شکل وصورت

میں بدل جاتے ہیں۔ جن پر بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔

اُس نے کہا تھا۔

''مجھے صرف کشمیر میں روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔''

ایک چھوٹا سا کنبہ ہوتا ہے۔ منفرد کنبہ یا مشترکہ خاندان۔ اس سے بھی بڑا ایک اور کنبہ ہوتا ہے جسے قوم کہتے ہیں۔ قوم سے بھی بڑا ایک خاندان ہوتا ہے جو ملک کہلاتا ہے۔ اپنے چھوٹے سے کنبہ سے ہمارا بڑا اقریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمارا اُس کے ساتھ لگاؤ رکھنا ایک قدرتی امر ہے۔ یہی لگاؤں اپنے وسیع معنی میں قومیت ہے۔ اور وسیع ترین معنی میں بین الاقوامی اخوت کا مظہر ہے۔ لیکن جب ہم اس تعریف کے عملی پہلو پر غور کرتے ہیں تو قوم کی یہ تشریح نامکمل ہوتی ہے۔ اصلی تعریف تو یہ ہے کہ ایک ملک میں آباد ایک عوامی معاشرہ خواہ وہ کئی جغرافیائی حدود میں منقسم کیوں نہ ہو، اس کے افراد کتنی ہی زبانیں کیوں نہ بولتے ہوں۔ وہ الگ الگ دھرموں سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں......قوم ہے اور قومیت وہ جذبہ ہے جو عوام کو ملک کے تئیں وفادار بننے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ برادارانہ طور پر رہنے کی تحریک بخشتا ہے۔

قومیت کا یہ جذبہ بنی نوع انسان کے لئے بے حد ضروری ہے!!

اور آج وہ روشنی بجھ چکی ہے!

مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کبھی مسلمان تھا۔ اور نہ ہی ہندو۔ تب بھی مجھے ان ناموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پر آج میں سوچ رہا

ہوں...... کیا اب میں پال کو اس گلی میں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ اگر اسے کوٹھی میں جاتے ہوئے قتل کیا گیا تو میں خون کا رنگ کہاں تلاش کروں گا۔؟ کہاں پاسکوں گا اُسے...... کہاں؟

اور اگر اس نیم تاریک گلی میں مجھے قتل کیا گیا؟؟

اور اس روز میں بے حد پچھتایا، جب میں نے سنا کہ خدا مر گیا......
خدا کی موت...... ایک عظیم سانحہ، ایک عظیم صدمہ...... پر کوئی ہنگامہ نہ ہوا، کوئی خون نہ بہا اور میری موت پر یہ کیسا ہنگامہ، میری موت کوئی سانحہ نہیں، کوئی صدمہ نہیں...... خدا عظیم ہے اور میں......؟!۔ شاید ایک سوالیہ نشان؟

بات چھوٹی سی تھی، پر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا۔ لڑکی ہندو اور لڑکا مسلمان۔ شادی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ وہ دیو پیکر ہیولا، وہ کالا دیو اب بھی محبت کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کالے دیو نے یوں تو محبت کی راہ میں ہمیشہ نوک دار کانٹے بچھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب کی بار اس نے جو روپ اپنا لیا ہے وہ بے حد گھناؤنا ہے۔ اب کی بار یہ کالا دیو دین ودھرم کا لباس پہنے اپنے تیز نوکیلے دانت باہر نکالے ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ کیوں کہ اُسے ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کا ملن پسند نہیں۔ مسلمان لڑکی اور ہندو لڑکے کا ملن پسند نہیں......... اور بس اتنی سی بات پر اتنا بڑا ہنگامہ!!

محبت کی شمعیں جلتی ہیں اور جل کر ہی روشنی بکھیرتی ہیں۔

محبت زندگی کی تفسیر ہے۔ پیار زندگی کا سرمایہ ہے اور وہ کالا دیو، بس ایک ملبے کا تودہ؟!

ہم لڑنا نہیں چاہتے، ہم میں سے کوئی لڑنا نہیں چاہتا۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، اپنے لئے، اپنے بچوں کے لئے، اپنی خوبصورت دھرتی کے لئے ہم فرقہ وارانہ میل میلاپ میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم گولیوں سے، خون خرابہ سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم صرف پیار ومحبت کو اپنانا چاہتے ہیں...... ہم کہتے ہیں، جنگ، لڑائی اور نفرت، ایکدوسرے سے دور رکھنے کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہم اس سیڑھی کو نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ انسانیت کی فتح چاہتے ہیں۔ ہاں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ لاتعداد ہیں اور اس سلسلے میں ساری دنیا کے عوام ہمارے ساتھ ہیں۔

..........اور یہاں ایک سہانی صبح کو جب سرخ وسپید درختوں کی ڈالیوں پر شگوفے نکل آئیں گے تو ایک نئی بہار کا آغاز ہوگا۔ فصلیں کاٹی جائیں گی۔ زعفران کے پھول کھِل اُٹھیں گے...... اور پھر کوئی خون کا جغرافیہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریگا۔

اہلیا ایرن برگ!

اُن کی باتیں اُن کے خیالات!!

ایرن برگ مر گئے...... کیا موت کے ساتھ ہی انسان کی سوچیں بھی مرجاتی ہیں۔ انسان کے خیالات بھی مرجاتے ہیں۔

رات کا جانے کون سا عالم ہے۔ میری نیند اُڑ گئی ہے۔ رات سونے کے لئے جاگتی ہے۔ سپنے ٹوٹنے کے لئے جاگتے ہیں اور نیلما ابھی ابھی روتے روتے سوگئی ہے۔

آؤ سو جائیں!

سونے کے لئے ایک بستر کی ضرورت ہے۔ اگر نیند آ بھی گئی اور میں سونا بھی چاہوں...... تو سوؤں گا کہاں۔؟ میرے پاس جو بستر ہے وہ کھردار اور ایک رنگ کا بھی نہیں میرا بستر تو ایک ABSRACT پینٹنگ ہے۔ جو بنانے والا سمجھتا ہے اور نہ ہی دیکھنے والا۔ میں خود اس راز کو اب تک نہ پاسکا۔ اگر سمجھ گیا ہوتا تو شاید میرے پاس بھی ایک ہی رنگ کا گداز نرم اور ریشمی بستر ہوتا...... اور آج شاہدہ میری بیوی ہوتی!!

کل تک میں خود نہ جانتا تھا کہ کتنے چہرے بنائے اور بگاڑے، اپنے بس کی بات تھی نا اور اب اپنے بس سے باہر...... بس سے باہر ہو کر کوئی بات اپنی نہیں رہتی۔!!

اور میں لا بیلا سے باہر چلا آیا۔ باہر آتے ہی ایک ٹیکسی مل گئی اور میں اوبرائے پیلس جا پہنچا۔ میں نے حسب عادت دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی...... خلاف معمول!!

میں نے پھر کھٹکھٹایا۔ اب کی بار ذرا زور زور سے۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ ذرا دباؤ سے خود ہی کھل گیا۔ اندر کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک سایہ سا کھڑا تھا......

سایہ قریب آ گیا۔

''تم آ گئے۔'' نیلما تھی۔

''ہاں۔!''

''تم بیٹھو۔ میں ذرا اٹھہر کر آؤں گی۔''

''کہا جارہی ہو۔؟''

''دہلی سے میرے ایک دوست آئے ہیں، بہت ہی پرانے۔''

''یہ تم نئی پرانی دوستی کا کب سے خیال کرنے لگی ہو۔؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو۔؟''

''کون ہیں یہ تمہارے پرانے دوست۔؟''

''نام نہیں بتاؤں گی۔؟ ایک منسٹر ہیں۔''

''نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں۔

''کیا جانتے ہو۔؟''

''کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔''

''یہ غالبؔ کا شعر ہے۔''

''ہوگا۔؟''

''کیا مطلب۔؟''

''میں جارہا ہوں۔!''

''تم بیٹھونا۔ میں بس ابھی آرہی ہوں۔

''میں نے کہا.......... ''پھر کبھی آؤں گا۔''

"I don't want to distrub you"

''کب آرہے ہو۔؟''

''مجھے فیضؔ کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ سنو گی۔؟''

''سناؤ۔!''

''وہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرراہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے۔''

میں نے فیض احمد فیض کا شعر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنایا۔

''کل آؤ گے۔؟''

''کل......؟۔ ہاں کس وقت......؟۔ میرا مطلب ہے کل کون سا وقت تم میرے لئے......؟''

اُس نے جان بوجھ کر بات کاٹ لی...... ''ٹھیک اسی وقت۔!''

میں چلا آیا۔ میں لابیلا نہ جاسکا۔ جاسکتا تھا۔ خود ہی حقیقت سے دنیا سے آشنا ہونے کی قوت کھونے کی کوشش کی۔ میں جانتا تھا کہ پاؔل نے میرا انتظار کیا ہوگا۔؟ اب بھی کررہا ہوگا۔ میں وہاں جاکر یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ زندگی میں میرا کوئی انتظار نہیں کرتا۔

انتظار...... سسکتی روتی خزاؤں کی شام......انتظار۔؟

اے لوگو!......اُٹھو اور مجھے سرراہ سنگسار کرو۔ میں نے محبت کی ہے، ایک کالی کلوٹی لڑکی سے محبت کی ہے......شاہدہ!!

جس کے بے داغ جسم پر چاند کے دھبے ہیں۔

''کوئی دھوئے گا یہ داغ؟......کوئی نہیں...... ہاں اب کوئی میرا انتظار نہیں کرسکتا۔ اور صوفیہؔ بس سوالیہ نشان اُبھرتا ہے!

کشمیر کی گود میں کتنے جنگل آباد ہیں۔ کتنے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کتنے

ندی نالے ہیں۔ سدابہار جوان۔ اُن کی روانی اور آواز میں ایک عجیب سی سرشاری ہے۔ سرمستی ہے۔ یہاں کتنے لوگ بستے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ...... ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان ...... یہاں مندر ہیں۔ مسجدیں ہیں۔ گوردوارے ہیں اور یہاں اس کشمیر میں مقدس چیزوں کی چوری ہوجاتی ہے۔ گرجوں کو جلایا جاتا ہے اور..........!!

دوسری صبح..........!

میں جب جاگا۔ میں نے سوچا، مجھے رات کی باتیں بھول جانا چاہئیں۔ میں نے دفتر میں اپنا مضمون لداخ کے لوک گیت۔" مکمل کیا اور اب آخری ٹچ دے رہا تھا۔ کہ نیلی کا فون آیا۔

"میں کل کے لئے بے حد شرمندہ ہوں۔"

میں نے سوچا۔ شرمندگی کیوں۔ کس لئے؟۔ میرے سوچوں کی دھار رُک گئی۔ یوں تو بقول بنسی میں مر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اچھی موت پانے کے لئے میں نے خطرناک تفاوت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اور اُسی شام نیلی سے ملنے گیا...... کوئی منسٹر نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی پرچھائیں۔ ایک نیلی تھی کمرے میں اور اُس کی بے زبان میمی ...... سامنے گلدان میں رنگ رنگ کے پھول تھے!

دل کی چنگاریاں ان لطیف رنگ رنگ کے پھولوں کی طرح فروزاں ہو رہی تھیں جو بس ایک لمحے کے لئے کھِلتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔

جانے یہ کس رات کا ذکر ہے۔ کون سی رات شروع ہو رہی تھی اور

کون سی ختم......شاید چوتھی پانچویں یا دسویں......کبھی کبھی ایک لمحہ بھی رات بن جاتی ہے۔ اور کبھی ایک رات صدی۔ میں بھی کئی لمحے کئی راتیں اور کئی صدیاں بتا کر نیلی سے ملنے آیا تھا۔ سوچتے سوچتے ذہنی طور پر ایک صدی اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

ایک صدی پہلے شاہدہ آئی تھی میری زندگی میں۔ اُس کی مسکراہٹ میں میری مسکراہٹ پوشیدہ تھی۔ میں جب پہلی بار شاہدہ سے ملا تو اُس کے سراپا نے مجھے بکھر کر گزرنے کی تحریک بخشی......میری تنہا تنہا سی زندگی کے لئے یہ احسان بڑا حوصلہ افزا تھا..........اور اُس کے بعد ایک اپنی اپنی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں تمہارے سامنے ہوں۔ اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھو۔ تم مجھے بالکل اپنے قریب پاؤ گے۔ میں جب تنہا ہوتی ہوں تو لگتا ہے جیسے تم دبے پاؤں میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں قدم رکھ چکے ہو..........ایک میٹھا سا پرکیف گیت بن کر۔"

لیکن ہر لڑکی کی طرح شاہدہ کی پسند، پیار اور فیصلے سے بڑا فاصلہ تھا۔ ایک ایسا فاصلہ جسے میں ناپ نہ سکا۔ جسے میرے قدم طے نہ کر سکے۔!

اور دیکھتے دیکھتے موت کی سی ویرانی چھا گئی۔ ہر سمت دھول اُڑنے لگی، جہاں میرے دل کا خوشنما بنگلہ شاہدہ کی ملگجی دھوپ کی چھاؤں میں کھڑا میری روح کی تسکین کا باعث تھا۔ وہ جھلسی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کے ایک عظیم انبار میں بدل گیا۔ میری بے نور سی بجھی بجھی آنکھیں مٹی اور راکھ کے

تلے جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میرے تھکے تھکے سے قدم رک گئے۔

سامنے گلدان میں رنگ رنگ کے پھول تھے!"

میں پھولوں کا ذکر چھیڑتا ہوں............ حسین چیزیں مجھے پسند ہیں۔ بالکل اپنی نیند کی طرح جو مجھے کبھی نہیں ملی۔"

"نیند کا پیاسا؟"

"مجھے نیند میں موت ملتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ موت سے میں پیار کرتا ہوں وہ روز مجھ سے ملنے آتی ہے۔"

"بات پھولوں کی تھی۔"

"ہاں بڑے معصوم پھول ہیں اگر تم بھی ان میں سے ایک پھول ہوتیں تو جانتی ہو میں کیا کرتا۔؟"

"مجھے پھولوں سے نفرت ہے پھر بھی ان سے پیار کرتی ہوں۔"

"تمہیں پھول میں عورت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔"

"شاید ٹھیک ہو۔ لیکن عجیب سی بات ہوئی کل۔!"

"کیا کوئی عجیب سا انسان ملا جیسے میں...... جیسے۔"

"کیا کل میں نے جو شراب پی اُس میں پھولوں کی خوشبو تھی...... کشمیر کے پھولوں کی خوشبو۔ کتنی اچھی ہے یہ خوشبو، پیار میں ڈوبی ہوئی درد بھری دھڑکن نہیں ہوتی جیسے۔"

"اگر تم نے شاعروں سے پیار کیا ہوتا۔"

کون سی ختم......شاید چوتھی پانچویں یا دسویں......کبھی کبھی ایک لمحہ بھی رات بن جاتی ہے۔ اور کبھی ایک رات صدی۔ میں بھی کئی لمحے کئی راتیں اور کئی صدیاں بتا کر نیلی سے ملنے آیا تھا۔ سوچتے سوچتے ذہنی طور پر ایک صدی اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

ایک صدی پہلے شاہدہ آئی تھی میری زندگی میں۔ اُس کی مسکراہٹ میں میری مسکراہٹ پوشیدہ تھی۔ میں جب پہلی بار شاہدہ سے ملا تو اُس کے سراپا نے مجھے کچھ کر گزرنے کی تحریک بخشی......میری تنہا تنہا سی زندگی کے لئے یہ احسان بڑا حوصلہ افزا تھا............اور اُس کے بعد ایک اپنی اپنی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں تمہارے سامنے ہوں۔ اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھو۔ تم مجھے بالکل اپنے قریب پاؤ گے۔ میں جب تنہا ہوتی ہوں تو لگتا ہے جیسے تم دبے پاؤں میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں قدم رکھ چکے ہو............ایک میٹھا سا پرکیف گیت بن کر۔''

لیکن ہر لڑکی کی طرح شاہدہ کی پسند، پیار اور فیصلے سے بڑا فاصلہ تھا۔ ایک ایسا فاصلہ جسے میں ناپ نہ سکا۔ جسے میرے قدم طے نہ کر سکے۔!

اور دیکھتے دیکھتے موت کی سی ویرانی چھا گئی۔ ہر سمت دھول اُڑنے لگی، جہاں میرے دل کا خوشنما بنگلہ شاہدہ کی ملگجی دھوپ کی چھاؤں میں کھڑا میری روح کی تسکین کا باعث تھا۔ وہ جھلسی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کے ایک عظیم انبار میں بدل گیا۔ میری بے نور سی بجھی بجھی آنکھیں مٹی اور راکھ کے

تلے جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میرے تھکے تھکے سے قدم رک گئے۔

سامنے گلدان میں رنگ رنگ کے پھول تھے!''

میں پھولوں کا ذکر چھیڑتا ہوں .... حسین چیزیں مجھے پسند ہیں۔ بالکل اپنی نیند کی طرح جو مجھے کبھی نہیں ملی۔''

''نیند کا پیاسا؟''

''مجھے نیند میں موت ملتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ موت سے میں پیار کرتا ہوں وہ روز مجھ سے ملنے آتی ہے۔''

''بات پھولوں کی تھی۔''

''ہاں بڑے معصوم پھول ہیں اگر تم بھی ان میں سے ایک پھول ہوتیں تو جانتی ہو میں کیا کرتا۔؟''

''مجھے پھولوں سے نفرت ہے پھر بھی ان سے پیار کرتی ہوں۔''

''تمہیں پھول میں عورت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔''

''شاید ٹھیک ہو۔ لیکن عجیب سی بات ہوئی کل۔!''

''کیا کوئی عجیب سا انسان ملا جیسے میں...... جیسے۔''

''کیا کل میں نے جو شراب پی اُس میں پھولوں کی خوشبو تھی...... کشمیر کے پھولوں کی خوشبو۔ کتنی اچھی ہے یہ خوشبو، پیار میں ڈوبی ہوئی درد بھری دھڑکن نہیں ہوتی جیسے۔''

''اگر تم نے شاعروں سے پیار کیا ہوتا۔''

''میں شاعری سے پیار کرتی ہوں اور اپنا وہ منسٹر۔ یہ پھول وہی لایا تھا۔ مجھے اُس سے ویسی ہی نفرت ہے جیسے کہ پھولوں سے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ میں صرف کانٹا ہوں۔''

''وہ ہنس رہی ہے!

''میں نے کہا...... ''نیلی میں جب بھی آیا، خالی ہاتھ آیا۔ اور جب بھی چلا کچھ لے کر چلا۔''

وہ پھر ہنس رہی ہے۔

حسین لمحے کتنی جلد گزر جاتے ہیں اور پھر زندگی تو صرف ناخنوں تک ہے۔ ناخنوں تک خون کی گردش ہے، اور اس کے بعد ایک خلاء..........؟!

''تم نے زعفران کے پھولوں کے کھیت دیکھے ہیں۔؟''

''ہاں۔!''

''زعفران کے پھول بھی دیکھے ہوں گے۔؟''

''ہاں۔''

''کب۔؟''

'بڑی دیر ہوئی جب میں حبہ خاتون بنی تھی۔''

''کیسے۔؟''

''بس بنی تھی۔''

''تم پھر یوسف شاہ چک کو بھی جانتی ہوگی۔؟''

''آؤ ماضی میں جھانک کر دیکھیں۔''

''کیوں۔؟''

''ہوسکتا ہے کہ آج کی رات ایک بیتا ہوا یگ لوٹ کر آئے۔''

نیلی نے اُٹھ کر الماری سے بوتل نکالی۔گلاس لے آئی۔

کال بل کا بٹن دبایا۔اُس نے کچھ آہستہ سے کہا۔ویٹر چلا گیا۔اُس نے گلاسوں میں شراب اُنڈیل دی۔ ویٹر دوبارہ آیا۔اُن کے ہاتھوں میں برف سے بھری پلیٹ تھی۔ نیلی نے گلاسوں میں برف ڈالی۔ویٹر چلا گیا۔

میری جانب گلاس بڑھاتے ہوئے نیلی نے کہا۔''چیرس۔''

میں نے سپ کیا اُس نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کرنا چاہا۔ پر ایسا نہ کرسکی۔ وہ شاید دن میں بھی پی چکی تھی۔ دن میں اقبال نے اُسے نگین جھیل کے ٹھنڈے پانیوں میں جن کی بوتل تھامے لہروں سے کھیلتے دیکھتا تھا۔اُس کے ساتھ نریندر تھا۔پتھروں کے شہر کا باسی جو بقول اُس کے نیلما سے عشق کرتا ہے۔مجنوں اور فرہاد کا سا عشق۔کبھی فرہاد دودھ کی نہریں کھودتا تھا۔اب فرہاد نگین جھیل میں اپنی شریں کے ساتھ نہاتا ہے۔اُس کے عریاں جسم کو اپنی جنس زدہ نظروں سے دیکھتا ہے اور دودھ کی بجائے جن کی ایک پوری بوتل پی جاتا ہے۔

''میں نے ہاتھ بڑھا کر میمی کو اپنے پاس کھینچ لیا۔آہستہ آہستہ پیار سے اُس کا منہ کھولا۔ چھوٹے چھوٹے بیحد نازک دانت، بے حد نازک زبان...... میں نے ایک ہی بار شراب سے بھرا ہوا گلاس اس کے منہ میں ڈال

دیا۔ تھوڑی سی شراب فرش پر گر گئی۔ اس نے اپنی پوری قوت سے چیخنا چاہا لیکن میں نے اُسے ایرانی قالین پر پھینک دیا۔

''یہ تم نے کیا کیا۔؟''

''میں نے میمی کو شراب پلائی۔''

''کیوں۔؟''

''اس لئے کہ میں آج پینا نہیں چاہتا۔ آج کی رات میں اپنے حصے کی ساری شراب میمی کو پلانا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اتنی پی لو کہ تم بہک جاؤ۔ جیسے............''

''خاموش کیا ہو گئے۔؟''

''جیسے یوسف شاہ چک بہکا کرتا تھا۔''

''پر میں یوسف شاہ چک کو نہیں جانتی۔''

''آج کی رات میں چاہتا ہوں کہ تم یوسف چک بن جاؤ۔''

''پھر کیا ہوگا۔؟''

''میں کسی کھیت میں جا کر حبہ خاتون کا کوئی گیت گنگناؤں گا۔''

''کون سا گیت۔؟''

''زعفران کے پھولوں کا گیت...... مجھے ایک گیت یاد آرہا ہے۔ اُس کا مفہوم یوں ہے۔ تم بھی سنو۔

میرے محبوب! میں چاہتی ہوں کہ آج کی یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔ ہم پر زعفران کے پھولوں کی بارش ہو اور ہم پھولوں

کے ڈھیر تلے دفن ہو جائیں۔

..........میرے محبوب میں چاہتی ہوں کہ آج کی یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔ ہم دنوں ساتھ ساتھ ہوں اور ہم پر اتنی برف گرے کہ برف کے ڈھیر تلے دفن ہو جائیں!''

''کتنا پیارا گیت ہے۔''

(خاموشی)

''پھر۔!''

''پھر تم میری آواز سن کر، اپنی ساری کائنات میرے قدموں میں ڈالو گی۔!''

''میرے پاس کیا ہے۔؟''

''تین چیزیں ہیں!''

''کیا۔؟ ذرا میں بھی جانوں؟''

''ایک تمہارا جسم۔!''

''یہ جسم تم پا چکے ہو۔''

''دوسری تمہاری قربت۔!''

''تمہارے پاس ہے۔''

''تیسری تمہاری ہاتھوں کی بنائی ہوئی شراب!''

''تم زندگی بھر میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی شراب پی سکتے ہو۔''

''بس مجھے زندگی بھر اور کچھ نہیں چاہیے۔''

''تمہاری باتوں میں کتنا تضاد ہے۔''

''شاید میرے دوست بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔''

''آج مجھے یقین ہو گیا ہے۔''

''کیسے؟''

''میرے پاس ایک اور شے ہے، بڑی خوبصورت، جاندار،''

''بھلا کیا؟''

''تم بخوبی جانتے ہو۔ مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔''

''کیسے۔؟''

''اُس نے تمہاری مٹی سے جنم لیا ہے۔ اُس کی رگوں میں تمہارے کشمیر کا خون ہے۔ اُس کا خمیرہ تمہاری مٹی سے بنا ہے۔''

''کس کی باتیں کرتی ہو؟''

''میں برجؔ کی بات کر رہی ہوں۔''

''برج۔!''

''برج۔!!''

صوفیہؔ......... چھوڑ دو میرا ہاتھ مجھے کیوں پکڑ رہی ہو۔ تم سمجھتی ہو، میں نے شراب پی لی ہے۔ نہیں نہیں صوفیہ۔ میں بھلا شراب پی سکتا ہوں......... کبھی نہیں۔ پر تم میرا انتظار کیوں کرتی ہو۔؟ سو کیوں نہیں جاتیں اور ابھی تک تم نے کھانا بھی کہاں کھایا ہوگا۔؟......... جا کھانا کھا لے۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ بالکل بھوک نہیں ہے۔

''میمی کو چڑھ گئی ہے۔ وہ ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بے مقصد دوڑ رہی ہے۔ شاید اُسے بھی کسی چیز کی تلاش ہے۔ ہاں تلاش ہے۔ وہ کچھ چاہتی ہے۔

''میں آج میمی کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''کیوں۔؟''

''ہوش میں نہیں ہے!''

''تو پھر کیا ہوا۔؟''

''اُسے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔''

''تم کہاں ڈھونڈتے پھرو گے اس کے لئے ساتھی۔؟''

''کیوں۔؟''

''تم میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔''

وہ بے چاری بے زبان ہے اور میں بے زبانوں کی زبان سمجھ لیتا ہوں۔!''

''ہے تمہارے پاس اُس کے لئے کوئی ساتھی؟''

''ہاں''

''کہاں۔؟''

''کسی ویران گلی میں کوئی بلا ضرور تمہاری بلی کے لئے بے قرار ہوگا۔؟''

''میں میمی کو اوباش نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔؟''

دفعتاً فون بج اُٹھا۔ نیلی نے ریسور اُٹھایا...... ''ہیلو......''

پھر نیلی نے میری طرف دیکھا...... ''تمہارا فون۔''

''میرا'' .... میں نے ریسور تھام لیا میرا ہاتھ کانپنے لگا۔

''کون۔؟''

''اشفاق۔!''

''کیا بات ہے۔؟''

''بات کرو۔''

''کس سے۔'' میں نے کہا۔ اشفاق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک زنانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی میں یہ آواز پہچان گیا۔ یہ مسز اشفاق تھیں۔''

''آپ کیا کر رہے ہیں وہاں۔''

''میں...... میرے ایک دوست دہلی سے آئے ہیں۔ بس اُس کے پاس بیٹھا ہوں۔''

''وقت کیا ہوا۔؟''

''میری گھڑی میں گیارہ بجے ہیں۔''

''جی نہیں رات کے تین بجے ہیں۔ اشفاق آپ کو لینے آ رہے ہیں۔''

''میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔''

''تو آ کر کھا لینا۔''

''وہ بھی بھوکی ہے۔!''

''وہ کون۔؟''

''میمی۔''

''کون میمی۔؟''

''میری جنگلی بلی۔!''

''بلی کو تین بجے رات تک بھوکا نہیں رکھا جاتا۔ بہر حال اشفاق آپ کو لینے آرہے ہیں۔ بلی کو اب آرام کرنے دیجیے۔''

فون بند ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر میری ساری باتیں درودیوار سے ٹکرا کر رہ گئیں اور میرے ماضی کے جھروکوں سے ایک صورت بن کر اُبھر آئیں۔''

''صوفیہ۔!''

''صوفیہ..........کہاں ہو تم۔؟..........کہاں ہو تم......؟

تب تک صوفیہ نہیں آئی تھی میری زندگی میں۔ میں نے دیکھا بھی نہ تھا اور میں اُس برگد کے پیڑ کی تلاش میں تھا جس کی جڑوں کو اپنائے گوتم بدھ کو نروان ملا تھا۔ بدھ کا فلسفہ، اُس کی حیات کی کہانی اور اُس کے اُصول آہستہ آہستہ میرے ذہن میں اُتر گئے۔ اور میں نے ٹوٹے پھوٹے گھر کے آنگن میں انجیر کے ایک درخت کے سائے میں ایک لڑکی کو دیکھا...... یہی صوفیہ تھی۔!

اور میری گونگی محبت کا آغاز ہوا۔ میں نے اپنے بارے میں سوچا۔ اکیلے میں ہر کسی کو اپنے بارے میں، کسی کے بارے میں سوچنے کا حق ہے اور

پھر یہ سوچیں مجھے جنم سے ملی ہیں۔ اب تک اُن ہی کے سہارے اپنی زندگی سے نباہ کئے جا رہا ہوں۔''

''تم بڑے جذباتی ہو۔''

''اپنا پن کسی میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے اپنے من کی بات کس سے کروں۔''

''تمہارے من میں کیا ہے۔؟''

''بس ایک گھر کا احساس......گھر کا انتظار۔؟''

''بہت بڑی بات ہے۔''

''اس لئے کہ میرے کمرے کا دروازہ دن رات کھلا رہتا ہے۔ ایک کمرہ ہے۔ اُس میں ایک ریڈیو ہے جس کو آج تک کسی نے نہیں چھوا۔ کوئی چھوتا تو شاید ایک دلربا نغمہ کمرے کی چار دیواری میں پھیل جاتا۔ ایک خوبصورت سا بستر ہے جس پر میں آج تک نہیں سویا۔ ایک صوفہ ہے جس پر میں آج تک نہیں بیٹھا۔ اُس کمرے میں ہر قسم کا سامان ہے جیسے کہ ایک گھر میں ہونا چاہیے۔ لیکن میں نے ابھی تک استعمال نہیں کیا۔

......بس ایک احساس اور انتظار کی بات ہے۔''

صوفیہ نے ایک لمحے کے لئے میری طرف اپنی بھرپور نظروں سے دیکھا اور کہا.......... ''کیوں۔؟''

''میں چاہتا ہوں کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی دوسرے کے لمس سے بند ہو۔ میرا ریڈیو کسی دوسرے کی اُنگلیوں سے جھنجنا اُٹھے۔ میرے بستر پر

کسی دوسرے کی دھڑکنیں سوئیں۔ میرے صوفے پر کسی دوسرے کی سانسیں اپنی یادوں کو سمیٹ لیں اور میرے کمرے کا سامان کسی دوسرے کے ہاتھوں سے بج اُٹھے۔ کتنی چھوٹی سے حسرت ہے۔ کتنی درد بھری تمنا ہے۔''

بات ادھوری رہ گئی۔ صوفیہ بن کہے چلی گئی۔ میں دیر تک اس کے قدموں کے نشانوں کو دیکھتا رہا۔ اُن میں اپنے ماضی کے نشانوں کو تلاش کرتا رہا اور اپنے مستقبل کے خدوخال ڈھونڈ تا رہا۔

اشفاق آگئے۔!

اُس نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا...... لیجئے میں خود ہی اپنا تعارف کرالوں۔ میں اشفاق ہوں۔ ابھی ابھی فون سے باتیں کر چکا ہوں، میں نادر کو لینے آیا ہوں۔''

''لے جایئے۔''

''میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ نیلی نے اشفاق سے کہا۔

''آپ کے لئے ایک پیگ بناؤں۔؟''

" I Dont Mind"

''کتنی بُری ہے یہ شراب۔ اور کس قدر اچھی ہے۔ اگر میں ایم اے کا طالب علم ہوتا تو میں شراب کی اچھائیوں پر اس قدر خوب صورت تھیس لکھتا کہ مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔''

''نیلی نے اشفاق سے کہا۔'' اپنے نادر سے کہیے کبھی ایسے ہی مجھے لینے کے لئے آجایئے۔''

''تم اب بھی چل سکتی ہو۔''

''تم تو اکیلے ہو۔''

''اشفاق ہے میرے ساتھ۔''

''ان کی جگہ برج کو لیتے آنا۔''

''برج۔!''

''برج۔!!''

اشفاق نے نیلی کی طرف حیران حیران نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔'' بڑے خوبصورت پھول ہیں۔!''

''جی ہاں، کشمیر کے پھول ہیں نا اسی لئے۔ ہماری طرف ایسے سندر پھول نظر نہیں آتے۔''

''آپ کہاں کی باتیں کر رہی ہیں۔''

''دہلی کی۔''

''او.........دہلی تو میں مہینے میں چار بار جاتا ہوں۔

پھر آپ سے ملاقات ہوگی وہاں۔؟''

''جی نہیں، مجھے افسوس ہے۔''

نیلی کا لہجہ سپاٹ تھا.........

''کوئی بات نہیں۔''

''میں نے موضوع کا رخ بدل دیا......'' اشفاق اگر یہ کمرہ تمہارا ہوتا تو کیا تم کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے؟''

''ہاں۔'' اشفاقؔ نے سارے کمرے میں بھر پور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔''

''میں نے پوچھا۔'' بھلا کیا۔؟''

''اگر یہ کمرہ میرا ہوتا تو میں ان ریشمی پردوں کو فوراً ہی بدل دیتا۔ قالین اور پردے کا رنگ ایک سا ہوتا یا یہ پردے بالکل ہی سادہ ہوتے۔ یہ الماری یہاں نہیں ہوتی،۔ یہ اُس طرف ہوتی۔ یہ قد آدم آئینہ بھی اس جگہ نہیں ہوتا.......... ہاں یہ کمرہ اگر واقعی میرا ہوتا اس دیوار پر قسم قسم کی شراب کی بوتلیں رکھتا...... یہ میرا بار ہوتا، اور میں یہاں..........''

نیلی نے بات کاٹتے ہوئے کہا......اور آپ کی..........''

بے ہوشی کا دور جیسے ختم ہو گیا۔ اشفاقؔ نے نیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نیلی نے خدا حافظ کہا۔

''میں نے کہا۔'' گڈ نائٹ''۔

نیلی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں کو اپنے ہونٹوں سے چھولیا۔ مجھے نیند سی آگئی۔

رات بڑی اندھیری ہے۔ لیکن کتنی خوبصورت ،کبھی کبھی بدصورت عورتیں بھی خوبصورت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ صرف احساس کی بات ہے۔!

لیکن وہ کالا دیو.....شاید دل کی گہرائیوں میں گم ہو گیا۔

چن ماہی سرو دا بوٹا۔

...............!!

میرا چاند جیسا محبوب تو سرو قد ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس سرِ رواں کو اپنے صحن میں لگا رکھوں۔

اور ایک دن صوفیہ کے انتظار اور احساس کی باتیں ختم ہوئیں۔ اور وہ میری بیوی بن کر میری زندگی میں آگئی۔

I loved her long.

I Loved her between the lines and against the clock.

I loved her long.

گل پوش، سرسبز و شاداب وادی کے ایک دل نشیں کنج سرینگر کے ایک چھوٹے سے محلے میں ایک اُجلی اُجلی سی کوٹھی ہے..........صبا۔؟"

یہ کوٹھی شہر کے ایک بڑے ٹھیکیدار ریاض احمد کی ہے۔ اور اس کوٹھی میں آج سے کوئی چھ سال پہلے شاہدہ دلہن بن کر آئی۔ اس کوٹھی میں روپیوں کی افراط ہے۔ فراوانی ہے۔ شاہدہ کو اس کوٹھی میں کائنات کی ساری مسرتیں مل گئیں...... میں خوش ہوا۔ مگر اس کے بعد مجھے اس بھری پری دنیا میں کیا ملا۔ یوں تو یہ ساری دنیا میری ہے۔ لوگ میرے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں اکیلا ہوں۔ یہاں کوئی چیز میری نہیں۔ البتہ یہاں کے سارے غم میرے غم ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اس کا ذمہ دار کون ہے؟۔ خود شاہدہ میں، ہمارا یہ سماج، یہ اونچ نیچ...... ہاں روپیہ سب کچھ خرید سکتا ہے۔ ایک کوٹھی، ایک گھر، ایک بستر اور اُس گھر میں بستر کو سنوارنے کے لئے ایک عورت...... محبوبہ یا بیوی کی صورت میں...... میں شاہدہ کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ ریاض کا بھی کوئی

قصور نہیں۔ ہاں میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔ میں نے بھی اگر بے ایمانی کر کے روپیہ بٹور لیا ہوتا۔ آج میرے پاس بھی کوٹھی ہوتی،۔ اور آج شاہدہ میری ہوتی،۔ میری زندگی کا سب سے بڑا جرم ایمانداری ہے۔ اور اس بات کا احساس پہلی بار مجھے اُس روز ہوا جب ایک بھری محفل میں شاہدہ کی شادی ریاض سے طے ہوئی۔ اور دوسری بار اُس روز ہوا جب نیلی نے مجھے اپنا سب کچھ دے کر بھی برج سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ صرف اس لئے کہ برج کے پاس ایک فلیٹ ہے۔ ایک کار ہے۔ فلمی دنیا کی گہما گہمی ہے، ہنگامے ہیں، رنگینی ہے۔ اور ایک بستر ہے جہاں سو کر نیلی کے جسم کی ساری تھکان دور ہو سکتی ہے، جہاں سو کر کوئی اس کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اور جہاں برج کی بجائے کوئی اور بھی سو سکتا ہے...... کوئی مشہور معروف فلمی ہیرو، کوئی ویلن، کوئی پروڈیوسر، کوئی ہدایت کار اور کوئی کہانی کار......... میں بھی ایک کہانی کار ہوں،۔ میں بھی خوبصورت کہانیاں لکھتا ہوں۔ میرے بازوؤں میں برج سے زیادہ شکستی ہے۔ میں برج سے زیادہ جوان دکھائی دیتا ہوں، صحت میں، خوبصورتی میں، قد میں......... پر وہی بستر کی بات ہے۔؟!

نیلی۔!!

میرے قریب آؤ۔ اور قریب۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں سما جاؤ۔ میری سانسوں میں اپنے شباب کا رس گھول دو۔ میرے خوابوں کو سجاؤ۔

نیلی۔!!!

کوئی جواب نہیں بس خاموشی ہے، بے حد پراسرار خاموشی !!

زندگی کی عمارت کے صرف چور دروازے ہوتے ہیں۔

چھوٹے بڑے راستے نہیں۔ میں اپنی زندگی کی عمارت میں ایک بڑے راستے کی تلاش میں ہوں۔ لیکن ابھی تک ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔

اور بہت جلد بہار روٹھ گئی۔ پھول مرجھا گئے۔ بید مجنوں کی ٹہنیاں کانپ گئیں۔ نرگس رونے لگی اور یاسمین کے پھول دل کے آنگن میں بجھ گئے۔

اُف، یہ کیسی چیخ وپکار ہے۔ کیسا شور وہنگامہ ہے۔ کیسی قیامت ہے۔ آخر ایک مسلمان کی محبت کا ایک ہندو کے دل سے کیا واسطہ۔ آخر ایک صابر کا پبن سے کیا تعلق۔ ہند، مسلمان، مسلمان، ہندو۔ یہ کیسا رشتہ ہے۔ یہ کیسا بندھن ہے۔؟"

رشتہ اور بندھن۔؟

عشق کا مذہب ہے عشق .... جنون، نابینائی، اندھا پن اور پیار ...... پھر وہی تفرقہ بازی، ۔ یہ مذہب اور دھرم کی آڑ میں ہوئی قتل وغارت، یہ بہتی خون کی ندیاں .... اُف، بند کردو یہ شور وغل، یہ ہنگامے، یہ سسکیاں، یہ آہ وزاری۔ کوئی پیار بھرا گیت چھیڑو۔ مخروطی اُنگلیوں سے کوئی شیریں نغمہ، مدھر گیت چھیڑو۔ دلوں کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ دل نہ مسلمان ہے اور نہ ہی ہندو.......... سمجھا دو۔ ان کالے دیوؤں کو۔ ان دیو پیکر ہیولاؤں

کو..........!!

ارے جہاں تیرے ہل چل رہے ہیں میرا چرخا بھی وہیں لے چل۔!

تمہاری ناک کی تیلی پر سورج کی ایک شوخ کرن آ پڑی اور وہاں سے روشنی کا ایک دھارا پھوٹا۔ اور اُس روشنی کی چکا چوند سے گھبرا کر تمام کسانوں نے اپنے چلتے ہوئے بیل روک لئے اور سبھی نظریں تمہاری طرف اُٹھ گئیں۔

اور دیکھتے دیکھتے ٹنگمرگ کے کھیت میری نظروں کے سامنے پھر گئے۔ ان کھیتوں سے ذرا پرے سڑک کے ایک طرف، سرکاری ڈاک بنگلہ سامنے آیا۔ جہاں میں نے کوثر کو پہلی بار دیکھا...... کوثر پہلی کشمیری فلم ''مائنز راتھ'' کی شوٹنگ میں شرکت کرنے آئی تھی۔ میں نے اُس دن پہلی بار کوثر کو دیکھا اور اُس کا کھویا ہوا چہرہ میری نظروں کی زینت بنا۔

اگر میں ایک کتا ہوتا اور مجھے ایک سپید تن یا کالے بالوں والی کتیا مل جاتی، سڑک کے کسی موڑ پر، کسی گوشے میں تو شاید یہ ازل ازل کی تنہائیاں، یہ جنم جنم کی بھوک مٹ جاتی...... اگر میں واقع کتا ہوتا تو سماج اور قانون کی پابندیوں سے آزاد ہوتا۔ یہ نقلی خول، یہ مصنوعی چہرہ اسی سماج اور قانون کی دین ہیں۔

سماج اور قانون کی باریکیوں اور نزاکتوں کا جال تو صرف آدمی کے لئے ہے۔ کتنے اور کتیا کے لئے نہیں۔ اُن کے لئے سماج اور قانون، پسند

ناپسند کی کوئی زنجیر نہیں۔ بھلا اُن کو پسند اور ناپسند سے کیا واسطہ۔ جہاں خواہش ہوئی، دل مچلا اور وہی پسند بن گئی۔ اُن کے لئے نہ کوئی ٹھیکیدار ہے اور نہ کوئی مزدور، کوئی ایمان دار ہے اور نہ کوئی بے ایمان، کوئی سڑک ہے نہ کوئی مکان......مساوات کے علمبردار یہ کتے اور یہ کتیاں۔؟

شاستروں میں لکھا ہے من بھٹکنے لگے تو اپنی آنکھیں بند کرلو۔ تمہیں سکون ملے گا۔ من کا سکھ مل جانے سے تن کے سارے دکھ دھل جاتے ہیں۔

پھر تیری کہانی یاد آئی، پھر تیرا افسانہ یاد آیا۔ کون سی کہانی یاد آرہی ہے۔ کون فسانہ چھیڑ رہا ہے۔

اور یہ بات نہیں کہ شاہدہ کے بعد اور نیلما سے پہلے میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ مجھے کسی لڑکی کے قریب آنے کا موقع نہ ملا۔ ان میں وہ عورتیں اور لڑکیاں بھی شامل ہیں جو مجھے گندی، کیچلی گلیوں کے نیم اندھیروں میں ملیں اور وہ بھی جو اپنے آپ کو کلچرڈ کہتی ہیں۔ دونوں کی باتیں کرر ہا ہوں۔

ایک زلیخا نام کی لڑکی آئی میری زندگی میں۔ وہ ڈاکٹر تھی۔ ایک شام کیپری میں حسن کے ساتھ کافی پی رہی تھی کہ میرا اس کے ساتھ تعارف ہوا۔ دوسری بار ہسپتال میں ملی اور دوسری ہی ملاقات میں وہ میرے یا میں اس کے قریب آیا۔ کئی دن ایک ساتھ بیتے اور ایک دن لندن چلی گئی۔

جانے سے پہلے اُس نے مجھ سے کہا.........تمہارے ساتھ گزری چند شامیں اپنا رنگ دکھا رہی ہیں۔‘‘

''کیا۔؟''

''تم سمجھدار ہو۔!''

''اور تم ڈاکٹر......''

''میرا پیشہ زندگی کو بچانا ہے، مارنا نہیں۔''

کہتے ہیں کہ جانے سے پہلے اُس نے یہ بات حسنؔ سے بھی کہہ دی تھی۔ جانے ہم دو میں سے کون مجرم تھا۔؟

ایک اُوماؔ بھی آئی میری زندگی میں وہ میری Collegue تھی۔ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں۔ جانے اُسے میری کون سی ادا بھا گئی کہ دفتر میں اپنا سارا وقت میرے ساتھ گزارنے کے بہانے تلاش کرتی۔ وہ مجھ سے اکثر کہتی...... ''تمہاری باتوں سے مجھے ہمیشہ بجھے بجھے سے خیالوں کا احساس ہوتا ہے۔''

میں خاموش رہتا۔ شاید اس لئے کہ، اُس کے بچے کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی اور اُس کا پتی............؟

انیتاؔ ممبئی کی رہنے والی تھی اور ہوٹل پمپوش میں ٹھہری تھی۔ میں نے اُسے کشمیر بک شاپ میں کشمیری لوک گیتوں پر کتابیں تلاش کرتے دیکھا۔ پھر ایک دن اچانک پہلگام کلب میں ملی۔ وہ امرناتھ یاترا سے لوٹ آئی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی شانتی تھی، میں نے خود ہی بات چھیڑی اور اُسے کئی گیت سنائے۔ اُسے گیتوں سے پیار تھا۔

کہنے لگی۔ ''ان لوک گیتوں میں جادو ہے اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے

میں ان لوک گیتوں میں گرفتار ہوگئی ہوں۔"

میں نے جب اُسے اُس شہزادے کی کہانی سنائی جواب بھی قبر کی تہہ میں ابدی نیند سویا کچے موتیوں کے پکنے کا انتظار کررہا ہے تو وہ پاگل سی ہوگئی۔ اس نے کوہ سلمان کے دامن میں اُس کی قبر دیکھی اور اُس پر ایک عجیب سے کیفیت چھاگئی۔

آنیتا کو دیکھ کر مجھ شمبنی لمس کا کوئی احساس نہ ہوا۔ بیحد ٹھنڈی لڑکی تھی وہ!

اور یہ آواز مجھے بہت دور لے جاتی ہے، یہاں سے کوئی اور آوازوں میں گھل مل جاتی ہے۔ شہنائیاں بجتی ہیں۔ قربتیں بنتی ہیں اور کوثر دلہن بن جاتی ہے۔

کوثر...... ایک میلی کچیلی گلی کی ایک پڑھی لکھی لڑکی۔!

جیسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو۔ جیسے بہتے ہوئے جھرنے گنگنا رہے ہوں۔

اُس کی شادی کے بعد جب میں پہلی بار اور آخری بار کوثر سے ملا، اُسی کے کمرے میں جو کبھی میرے مصرف میں تھا، اُس کمرے کی ہر شئے بدلی ہوئی تھی۔

میں نے کہا........."میری چھاتی میں آگ سلگ رہی ہے۔ نہ معلوم مجھے کیا ہوگیا ہے۔ دل کا جوالا مکھی جیسے سلگ رہا ہے۔"

"اے میرے خدا۔"

"کیا ہوا تمہیں۔ تم کبھی ایسی نہ تھیں۔؟"

''دروازے پر ابھی کون تھا.........کون ہے وہاں۔؟ قدموں کی آہٹ سن رہے ہو۔؟''

''ہاں۔!''

''کس کی آہٹ ہے یہ۔؟''

''تمہارا احسان ہوگا!''

''ہائے اب میں کیا کروں۔کہیں اُس نے دیکھ لیا تو۔؟''

''تمہارا احسان ہم دنوں کے ماضی سے واقف ہے۔''

ماضی چاہے کتنا ہی گھناؤنا کیوں نہ ہو، حال پر چھا جاتا ہے حال کی ساری مسرتیں، ساری خوشیاں، ساری کامیابیاں، اُس کے دھندلے سایوں میں چھپ جاتی ہیں۔ بے کیف سی لگتی ہیں۔اور یادوں کے دریچوں سے جھانکنے والی ماضی سے چھوٹے چھوٹے بے معنی واقعات اور دکھوں سے بھرے ہوئے حادثے بھی قوس وقزح کے رنگوں میں لپٹے ہوئے نہایت خوبصورت لگتے ہیں۔

آندو ایک عجیب سی لڑکی تھی۔اُس کی باتوں میں کوئی تسلسل نہ تھا۔ اُس کی سوچوں کا کوئی جوڑ نہ تھا۔وہ نفسیات پر بات شروع کرتی اور وائلن کے تاروں میں اُلجھ کررہ جاتی۔

اُس نے کہا.........کل تک میرے ساتھ زندگی کا آئینہ تھا جس میں خود کو دیکھ سکتی تھی۔اب یہ زندگی ایک راہ بن گئی ہے۔اس راہ کی کوئی منزل نہیں۔''

مجھے منزل تلاش کرتے کرتے کئی مہینے لگ گئے اور جب میں منزل پانے میں کامیاب ہوا تو وائلن کے تار ٹوٹ چکے تھے۔

اور بھی کئی چہرے ہیں، کئی کہانیاں ہیں۔ کن کن کا ذکر کروں ۔وقت کم ہے اور یہ کہانی...... انجام سے بے خبر کہانی مکمل کرنی ہے۔سونے سے پہلے، نیند آنے سے پہلے، رات کے اس اندھیرے میں...........!

نیند نہیں آتی!!

کاش رات کا میٹھا پیارا خاموش اندھیرا نہ ہوتا۔ صرف خنک ہواؤں کی چینچل سی سرسراہٹ ہوتی اور صرف میں ہوتا اور صوفیہ......!

نیند نہیں آتی!

آؤ سو جائیں!!

یہ سب اُلجھے ہوئے لمحوں کے چہرے ہیں۔اور ان چہروں پر محبت کی جو ریکھائیں ہیں، چاندنی راتوں کی سرگوشیاں ہیں۔ کچھ کھونے اور کچھ پانے کی شرمیلی ادائیں ہیں، وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔اُن کی جگہ ایک عجیب سی کرب ،ایک انوکھی سی تڑپ ہے..... جیسے بھوکی دھرتی ہو، بھوکا کسان ہو، بھوکا آسمان ہو۔کوئی بادل نہیں۔کوئی بارش نہیں،کوئی بوند نہیں،کوئی آس نہیں صرف ایک ملاپ اور زندگی بھر کا انتظار......؟!

نیلما کے ایک خط کی چند باتیں یاد آرہی ہیں۔

I can feel your lonelines in life but you must have patience and strength in your life to live. People say life is very short

but I think life is too long and you might be feeling the same. But dont forget that we are not yet surrounded in our enlightened period by a little flower that can be casually plucked from our life path. Look at me..........

زندگی کی یہ دوڑ کبھی ختم نہ ہوگی۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ کسی کے لئے نہیں رکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بھاگنا پڑتا ہے۔ وقت کی یہ دوڑ کبھی ختم نہ ہوگی۔

رات کافی بھیگ چکی ہے اور میں اب بھی لکھ رہا ہوں۔ اس کہانی کو اپنے ہی ہاتھوں بنانا، ....سنوارنا اور دفنانا ہے ..... کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ باہر بے حد اندھیرا ہے۔ اور میں سونا چاہتا ہوں۔

نیند نہیں آتی۔!

چلتے چلتے ایک کتا رُک گیا۔ دوسرے کتے نے تعجب سے اُس کی جانب دیکھا اور خود بھی رک گیا گویا دوسرے کتے سے رکنے کی وجہ دریافت کررہا ہو۔ اور پھر دونوں نے اپنی گردنیں اُونچی کیں اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید اُن دونوں کو بھی انتظار تھا.......... کبھی کبھی انتظار خود ہی نا اُمید ہو کر سو جاتا ہے۔

یہ سپنے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ ان سپنوں میں میں کبھی کبھی اپنے جسم سے باہر آتا ہوں۔ صوفیہ سے باتیں کرتا ہوں .... تم سمجھتی ہو کہ مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ سکون ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میری آتما

میری روح کچھ اور بھی چاہتی ہے۔تم تو صرف ایک بیوی تک محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ بس چاول نہیں، لکڑیاں نہیں ہیں، بچوں کے کپڑے نہیں ہیں۔ شادی میں شرکت کرنی ہے۔ کسی کی موت پر ماتم کرنا ہے۔ دنیا داری کی باتیں.........پھر سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور میں آسمان کی وسعتوں میں دیکھنے لگتا ہوں اور انتظار نا اُمید ہو کر سو جاتا ہے۔اور پھر جیسے میری روح آکاش کی وسعتوں کو چیر کر اندھیرے اور روشنی کے سمندر کو پھاڑ کر میرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور مجھ میں زندگی کا احساس جاگ اُٹھتا ہے اور میں سوچتا ہوں نیلما ایک سراب ہے۔ چاول لکڑیاں، بچوں کے کپڑے، شادی بیاہ، ماتم، دنیا داری.........حقیقت!!

میں نیلی کے سامنے بیٹھا ہوں۔میرے ہاتھ میں ایک خط ہے جو آج ہی نیلی کو ملا ہے۔ برج نے لکھا ہے۔عام سا انداز ہے۔ عام سی بات ہے۔

''مبارک ہو۔''

''کس لئے؟''

''برج کا خط!''

''میں چاہتی ہوں کہ جواب تم لکھو۔''

''کیوں۔؟''

نیلی نے پیڈ اور قلم میرے سامنے رکھا ہے۔ کیا لکھوں، اور کیا نہ لکھوں......قلم ہاتھ میں تھام لیا ہے اور سیاہی چکنے کاغذ پر پھیل رہی ہے۔

''میں زندگی میں بہت کچھ جیت کر بھی ایک ہارا ہوا انسان ہوں۔ اور میں نے گندی گلیوں میں گھومنے کے بعد ایک شبنمی لمس حاصل کرنے کی صرف تمنا کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری اس تمنا کا نام ہار ہے۔ پھر بھی میں نے ایک کہانی سوچی تھی اور اُس کہانی کو حقیقت کا روپ دینا چاہا تھا۔ پر مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کچھ بھی نہ پاسکوں گا۔ میرے قدموں کو کبھی نصیب نہ ہوا کہ وہ بھی چلتے چلتے پیار کی چھاؤں میں ذرا بھر کے لئے رُک جائیں اور سفر اور اُس سفر کی تنہائیاں.........شاید بہک گیا ہوں میں۔ لیکن سب کچھ پہچان رہا ہوں۔ تم نے نیلی سے بڑے پیارے انداز میں گھر کی باتیں کی ہیں۔ لیکن اس خط کے بعد نیلی کے کالے دیوؤں کی باتیں کروں گا۔ اور شاید تم نہیں جانتے کہ تمہاری نیلم پری کا ایک کالا دیو میں بھی ہوں.........''

اب مجھ سے اور نہیں لکھا جاتا۔ میں نے خط نیلی کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ بغور اُسے دیکھ رہی ہے۔ پڑھ رہی ہے۔ اُس کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں ایسا لکھوں۔ اُس نے کاغذ کا یہ پرزہ، یہ ادھورا سا خط آہستہ سے اپنے بیگ میں ڈال دیا ہے۔ شاید کبھی نہ پوسٹ کرنے کے لئے۔

میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا ہے۔ اندھیرے کو چیرتی ہوئی میری نظریں زیتون کو دیکھ رہی ہیں۔ اُس کے کمرے کی کھڑکی بند ہے۔

زیتون.........تیری ڈولی آکاش کی بلندیوں سے اُتری اور پری محل کے کھنڈروں کی پریاں تجھے اپنی گود میں لئے گھوم رہی ہیں۔ یہ آبشار، یہ پہاڑ، یہ

ندیاں، یہ نالے تیری ناز برداری میں مشغول ہیں۔ مجھے بتا کہ تیری جڑوں میں کون پانی دیتا ہے جوتو اس قدر سرسبز ہے۔خوبصورت ہے۔سندر ہے۔

اندھیرا.......... میں کس زیتون کو تلاش کرر ہا ہوں، اب یہاں کوئی زیتون نہیں رہتی...... میں نے کھڑکی کا پٹ زور سے پھر بند کیا ہے۔ مجھے بھی رات کے اندھیرے میں تلاش کرو۔ میری لاش کو ڈھونڈو۔ میں آج کی شب خودکشی کرر ہا ہوں۔!

مجھے حلیم کشمیری کا گیت یاد آرہا ہے۔

میرے لئے ایسی قبر بنانا۔
جہاں برف ہو۔
جہاں ہر سال برف گرے۔
تمام عمر آگ کی جلن میں تڑپتا رہا۔
موت کے بعد
برف کی قبر میں سکون چاہتا ہوں۔!!

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ خودکشی وہ لوگ کرتے ہیں جو کم عقل اور علم وفلسفۂ حیات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ خودکشی کرنے والے جاہل اور کم عقل ہیں تو پھر میکسم گورکی، موپاساں اور ٹالسٹائی کی گنتی کن لوگوں میں ہوگی، جب کہ یہ تینوں جرم خودکشی میں ماخوذ تھے۔اس کے علاوہ ایرنسٹ ہمینگوئے، وان گاگ، اور فلسفی شاعر پیٹرسن نے خودکشی کی تھی۔ ان دانش مندوں کا یہ اقدام خودکشی کیا جہالت اور کم عقلی کے باعث تھا؟۔

اس کے باوجود خودکشی دنیا کا بدترین جرم ہے۔

نام: نامعلوم

مقام پیدائش: کشمیر

تاریخ پیدائش: ۹ر جولائی ۱۹۳۶ء

مقام وفات: نامعلوم

وقت: نامعلوم

تاریخ وفات: نامعلوم

زندگی کا نام موت ہے اور موت کا نام ہے زندگی !!

زندگی نہیں ایک خاموشی ......طویل ترین خاموشی۔

گیان دتو نے پٹّن آ گر یئے......

جب تجھ کو اپنے منبع نے گیان دیا تو تم نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈبو دیا!

جہلم کا خاموش بہتا پانی مجھ سے کہہ رہا ہے چپکے چپکے سے کہہ رہا ہے۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔

میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں۔

''کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں یہ سچ ہے'' دل سے آواز آتی ہے۔

''جہلم بڑا گہرا ہے۔''

''اس کی گہرائیوں میں تمہیں سکون میسر ہوگا۔''

مگر میں مرنا نہیں چاہتا''

''جی کر بھی کیا کرو گے......''

''شاید تم بھول چکے ہو۔''

''کیا؟''

''جہلم کے اسی کنارے تم شاہدہ کے ساتھ کئی بار بیٹھے ہو۔''

''ہاں ہاں، مجھے یاد آرہا ہے۔''

''اس بہتے ہوئے پانی کی سطح پر تم نے شاہدہ کے ساتھ مل کر شکارے کی سیر بھی کی ہے۔''

''ہاں۔''

''جہلم کے اسی کنارے کے قریب شاہدہ نے پہلی اور آخری بار تمہارے بند ہونٹوں کو چوما تھا۔''

''مجھے سب کچھ یاد ہے اُس لمحے کی یاد ابھی تک میرے دل سے نہیں گئی۔''

''کیسے جا سکتی ہے۔ یاد ہے شاہدہ نے کیا تھا۔''

''بھلا کیا؟''

ایک شام شاہدہ نے تمہارے قریب سمٹ کر کہا تھا،''میں تمہاری ہوں۔''

''پھر''

"پھر وہ چلی گئی اور تم سوچتے رہے کہ وہ لوٹ کر آئے گی لیکن وہ لوٹ کر نہیں آئی۔ اور اب نیلما بھی جا رہی ہے وہ بھی لوٹ کر نہیں آئی گی۔ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے یہ دنیا کا پرانا دستور ہے۔"

میں خاموش ہوں اور اپنے دل سے پوچھتا ہوں۔ لیکن دل جہلم کے بہتے ہوئے پانی کی طرح خاموش ہے۔

شاہدہ، نیلما......اور خودکشی

میں ابھی مرنا نہیں چاہتا صرف سونا چاہتا ہوں،

آؤ سو جائیں......!!

کل سویرے نیلما واپس جا رہی ہے۔

ہر آدمی کی زندگی پری کی کہانی ہے،۔ جسے خدا نے خود اپنی ہی اُنگلیوں سے لکھا ہے.......... میرے زندگی کے چند سسکتے لمحوں کی یہ کہانی بھی پری کی ہی کہانی ہے۔ لیکن یہ کہانی ادھوری ہے اور یہ ادھوری کہانی ختم کرنے سے پہلے میں اُس ملاقات کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں جو دہلی کے ہنگامہ پرور شہر میں نیلما سے ہوئی۔

اور وہ رات سرد سرد سی تنہائیوں کی رات اور میں صرف ایک گنہا گار انسان، اپنے گناہوں میں اضافہ کرنے کا تمنائی اور نیلما ایک عورت تھی۔!!

..........ایک عورت تھی۔!!

"دہلی کی روشنیاں بڑی سمجھدار ہیں۔"

"کیوں۔؟"

''میں آیا، ایک دم بجھ گئیں۔''

''لیکن ٹارچ کی روشنی۔؟''

''مدھم چیزوں سے مجھے پھولوں کی طرح نفرت ہے۔''

''میں نے راستہ تو دکھایا۔''

''گمراہ کرنے کیلئے اکثر اپنے ہی راستہ دکھاتے ہیں۔''

''کیا لوگے۔؟''

''بس تمہاری باتیں۔''

''تم جانتے ہو میں......؟''

میں نیلی کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا ہوں۔ دیواروں کا رنگ، کھڑکی پر لٹکے پردوں کا رنگ، صوفہ اور کرسیوں کا رنگ ایک جیسا ہے، کمرے کی ہر چیز سے نفاست ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی خواب گاہ ہے، نرم نرم بستر......!!

اور اب میرے سامنے ڈائری کے چند اوراق ہیں، کاغذ کے اِن اوراق پر نیلی کی زندگی کی داستان بکھری پڑی ہے، یہ داستان اس نے خود لکھی ہے ایک ڈائری کی شکل میں......!

دنیا میں جتنی چیزیں وجود میں آتی ہیں اُن کی ابتداء عورت سے ہوتی ہے۔

پہلا ورق..........

کشمیر دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ ہے۔

میں اپنے کشمیر لوٹ جاتا ہوں۔

دوسرا ورق......

میری نظروں کے سامنے ایک دیو پیکر آدمی کی صورت گھوم جاتی ہے جو کاروں اور ٹکسیوں کا بزنس کرتا ہے جو ایک ہوائی سفر کے رواں نیلی کے قریب آیا۔ یہ صورت اب آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتی جاتی ہے، ایک اور صورت اُبھر رہی ہے، یہ صورت بھی کشمیر سے تعلق رکھتی ہے، گنگریالے بال، موٹی موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، یہ اُمیندر ہے۔ ایک کامیاب وکیل، جو کئی سال پہلے ایک پارٹی میں نیلی کے قریب آیا محبت کا اظہار ہوا لیکن آہستہ آہستہ محبت کا جذبہ خود بخود ہی ٹوٹتا چلا گیا۔

ڈائری کے اوراق اُلٹ رہا ہوں۔

مجھے زندگی سے کیا ملا، کیا دیا زندگی نے مجھے...... بے چینی، بے قراری، غم بے شمار غم، زندگی سے جس قدر قریب آنے کی کوشش کرتی ہوں وہ اُس قدر دور ہوتی جا رہی ہے...... آج میری ماں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں، باپ کو گلہ ہے کہ میں نے اُنہیں کچھ بھی نہ دیا...... آخر چاہتے کیا ہیں یہ لوگ مجھ سے...... بنگلہ، کار، روپیہ، سب کچھ تو دے چکی ہوں......اور اب محبت......!!

ورق اُلٹ رہا ہوں۔

یہ بھوشن کی باتیں ہیں، ممبئی کے ایک چترکار کی کہانی ہے۔ میں اُنہیں نہیں جانتا......کئی اوراق خالی ہیں......اب ایک اور چہرہ نظروں کے

سامنے گھوم رہا ہے یہ نریندر ہے، جموں کے ایک تاجر کا اکلوتا بیٹا......اوباش نیلی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے، خودکشی کی دھمکی دیتا ہے......انکار......!

زندگی بڑی پیاری شئے ہے!

ایک موت......ایک خلا......!

ڈائری کے اوراق خاموش ہو گئے۔ یہ خاموشیاں کئی اور چیزوں کی روپ ریکھا کو نمایاں کر رہی ہیں، شاید نیلما یہ نہیں جانتی کہ میں اِن چہروں کو جانتا ہوں۔ خاموشیوں کو چیرتا ہوا آہستہ آہستہ جو خدوخال میرے سامنے آرہے ہیں یہ افضل کے ہیں جو ایک انجینئر ہے اور جو مشتاق کے ساتھ نیلما سے ملا اور مشتاق کو نیلما کے قریب لانے کا سہرا نریندر رہی کو ہے۔

سال نو کا مبارک باد دیتے ہوئے میں نے افضل سے کہا...... ''افضل صاحب کچھ باتیں آپ ضرور میرے بارے میں جان چکے ہوں گے لیکن آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اشفاق میرا ابھی دوست ہے اور آپ کی باتیں مجھ تک بھی پہنچ سکتی ہیں۔

''کون سی باتیں''

''باتیں صرف نیلما کی ہو رہی ہیں۔''

''میں نیلما سے کبھی نہیں ملا''

''میں آپ کو سچ بولنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا، مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں،''

افضل خاموش ہو گیا ہے۔

اب اس کے ہونٹ حرکت کررہے ہیں۔

''ہاں میں نیلما سے ملا ہوں ٹھیک اسی دن جب نریندر نے اوبرائے میں ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نیلما ایسی لڑکی نہیں کہ فوری طور برج سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

''میں اس بارے میں آپ کی رائے جاننے کا تمنائی نہیں، صرف آپ کے اور نیلما کے رشتے کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''ہم ضرور ملے۔ بس سمجھ لیجئے جیسے کبھی کبھی اندھیری رات میں آپ ٹرین میں سفر کررہے ہوں اور آپ کی ہم سفر ایک لڑکی ہو۔ چند لمحوں کا ساتھ اندھیری راتوں کے خدشے دور کردیتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے۔''

''صبح ہوتے ہی یہ خدشے پھر حقیقت بن کر سامنے آجاتے ہیں۔''

''بس سمجھ لیجئے کہ صبح ہوتے ہی میں کسی اور سٹیشن پر اُتر گیا اور نیلما اگلے سٹیشن کی جانب چل پڑی۔''

''سفر تو ایسے ہی کٹ جاتا ہے لیکن فاصلے نہیں مٹتے۔''

''بس بات یہیں آکر رُک جاتی ہے۔''

افضل مسکرا رہا ہے......!

میری نظر گھڑی پر ہے۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ اور بھی زیادہ اجنبی بن گیا ہوں۔ کیونکہ نیلی وہ نہیں جو اوبرائے پیلس میں ملی تھی۔ بڑی عجیب سی، بڑی اجنبی سی نیلی۔!

بات برج کی چلی، بہت سے جملے، بہت سی پیار کی باتیں۔اور آکاش اوردھرتی کاملاپ، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔

............عورت کتنی بدذات ہے اور برج سے شادی ایک سوال............دل کسی کا دوست نہیں۔!

میمی کی کچھ صحت بنی ہے۔''

''ہاں پہلے سے کافی موٹی ہوگئی ہے۔''

''کشمیر سے دہلی تک جانے میں جانے کتنے چوہے کھا چکی ہوگی۔''

''میمی چوہے نہیں کھاتی۔لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو۔؟''

''تم سمجھتی ہو کہ میں اُلجھی ہوئی باتیں کرتا ہوں۔''

''ہاں تو۔!''

میں بات کارخ پھیر دیتا ہوں......''میمی میرے پاس آ۔''

''بے زبان ہے، تمہاری باتوں کو کیسے سمجھے۔؟''

''کیوں......؟''

''تم اپنے دل سے پوچھو۔''

''بتادوں۔؟''

''اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں۔''

''میمی کا دل ان دنوں دہلی میں نہیں لگتا۔''

''کشمیر لے چلوں اُسے۔؟''

''نہیں ممبئ جانا چاہتی ہے۔''

''کشمیر سے ممبئ تک کا راستہ بہت طویل ہے۔ شاید یہ راستہ طے کرتے ہوئے۔ میمی کچھ اور چوہے کھانے کو ملیں۔''

''پھر۔!''

''میمی ممبئ نہ جاسکے گی کسی اور شہر کو اپنائے گی۔''

عورت ایک بلی ہے۔

اور مرد.......... ایک چوہا۔ صرف ایک بار بلی کے پنجوں میں پھنس گیا اور ہمیشہ کے لئے کھو گیا۔ اُس کا وجود اُس کی باتیں۔ اس کے خیالات، اس کی سوچیں اور...... سبھی کچھ؟!

میں مکان سے باہر آ گیا ہوں۔ رات کے دو بجے ہیں۔ نیلما میرے ساتھ ہے۔

''سنو۔؟''

''کیا ہے۔؟''

''میں پرسوں ممبئ جارہی ہوں، برج کی برتھ ڈے پارٹی ہے نا۔ میں ساری چیزیں خرید چکی ہوں۔ ہاں میرا ایک کام کرو گے۔؟''

''ہاں ہاں۔!''

''میں ڈپلومیٹ کی چار پانچ بوتلیں ساتھ لینا چاہتی ہوں۔''

میں سوچ رہا ہوں..........

''کیا سوچنے لگے۔؟''

''لے آؤں گا۔!''

''میں خود لے آتی کل سویرے Flight پر جانا ہے اور پرسوں ڈرائی ڈے ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔''

نیلی اندر چلی گئی ہے۔ میں ویران ویران سی سڑک پر اکیلا کھڑا ہوں۔ رات بڑی اُداس ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔

..........نیند نہیں آتی !!

میں نے دوسری شام نیلما کو فون کیا۔ معلوم ہوا، وہ اُسی صبح ممبئی چلی گئی ہے.......... میں نے سوچا، کیا مجھے شراب پلا کر نیلما بے خود کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ نہیں جانتی پینے کے بعد میں زیادہ حساس بنتا ہوں۔ دل کا آدمی ہوں نا..........!!

میں ایک کہانی کار دوست کے ہاں ٹھہرا ہوں......

کہانیاں بنتی ہیں اور بن بن کر مٹ جاتی ہیں۔ زندگی میں بے حد تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تلخ بنانے کیلئے بوتلیں خالی ہوتی جارہی ہیں.......... کئی دن بعد نیلما لوٹ آگئی ہے میں ساری تحریریں، سارے افسانے، سارے جملے اور ساری باتیں لوٹا دیتا ہوں۔

میں کشمیر لوٹ آتا ہوں!

رات کتنی اندھیری ہے۔ کل اور آج کی رات میں کتنا فرق ہے۔ کتنا فاصلہ ہے اور اس فاصلے کو میں کن قدموں سے عبور کروں۔ اس اندھیرے کو کن روشنیوں کے سہارے دور کروں۔ تھک سا گیا ہے میرا وجود!!

جنگلی بلی ....ہے میٹھی میں ہاتھ میرے اور ہوں اکیلا میں

شہری عورت!!..........

میں نے اُسے آزاد کر دیا ہے۔ وہ بھاگے جارہی ہے۔ اپنے ساتھی کی تلاش میں!

اب میں بالکل اکیلا ہوں!

شام سے پہلے ہی مر چکا ہے شہر!

میں اپنے قدموں کی بھاری چاپ لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ دو الگ الگ دنیاؤں کی بات ہے۔ ایک بڑی رنگ آلود اور دوسری نہایت ہی زنگ آلود.......... جیسے میری دنیا رنگ اور زنگ میں امتیاز لازمی ہے۔ وہ دنیا لاکھ پُر تصنع اور بناوٹی سہی۔ مگر سارے فلسفے وہاں دم توڑ تے نظر آتے ہیں.......... میں پھر بھی تنہا ہوں اور اب شاید ساری عمر اُس شبنمی لمس کے انتظار میں جاگ جاگ کر بسر کرنا ہوگی، جو ایک خواب کا روپ دھارن کر رہا ہے۔ اس لئے کہ میرے پاس دل کی دولت کے سوا کوئی دوسری پونجی نہیں۔!

میں اس گلی سے باہر آ گیا ہوں۔ اب میری نظروں کے سامنے ایک بڑی کشادہ سڑک ہے۔ اس کے ایک کنارے جھیل کی دنیا بسی ہے اور دوسرے کنارے شنکر آچاریہ کا پہاڑ کھڑا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک پوری بستی آباد ہے۔ اب میرے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ گلی ہے۔ میں اس گلی میں سے گزر کر سامنے ایک مکان کو دیکھ رہا ہوں۔ سارا مکان محلے کی نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہاں ایک کمرے کی کھڑکی سے مدھم مدھم سی روشنی

دکھائی دے رہی ہے............میرا گھر اور اُس گھر میں صوفیہ............!!

میں دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔

صوفیہ آ رہی ہے.......... صوفیہ جس میں پہاڑی ندی کی چنچلتا ہے۔ پہاڑوں پر بکھری چاندنی کی چمک ہے۔ میں واپس مڑ رہا ہوں۔ بھاگ رہا ہوں......گلی......کشادہ سڑک......بازار......میں بھاگتے بھاگتے رک گیا ہوں۔

میرے قدم تھم چکے ہیں۔

میں ایک ویران سی گلی میں ہانپ رہا ہوں۔!

میرے بالکل سامنے ایک مکان کا دروازہ اچانک کھل گیا ہے۔ اور دروازے میں کھڑی ایک لڑکی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ اجنبی سا چہرہ ہے۔ اجنبی سی آنکھیں اور ان آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی مدھم مدھم سی روشنی سے میری ضمیر کی تاریکی دور ہونے لگی ہے۔

میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ لڑکی دروازے سے ہٹ رہی ہے۔ جانے اُس کا کیا نام ہے............شاہدہ، نیلما، اُوما، کوثر............ میں آگے بڑھ رہا ہوں......اور آگے............!!

لڑکی سامنے ہے۔!

میں............میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔!

اور پھر............زور سے دروازہ بند کرتا ہوں۔!!!

ناولٹ

لمحے اور زنجیریں

نور شاہ

انتساب

فرقان

فواد

اور

داور

کے نام............!!

نورشاہ کی کہانیاں جہاں انسانی زندگی کے نشیب وفراز کا آئینہ ہیں وہاں ان میں زندگی کی ہولناکیوں اور مسرت آفرینیوں کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

ٹھاکر پونچھی

ان دونوں کے درمیان ایک دروازہ حائل تھا!

دروازے کے ایک طرف تاج تھی جس کی نگاہیں پرشوق انداز میں بار بار جھانکا کرتی تھیں، یہ دروازہ آنگن کی طرف کھلتا تھا اور جب اسے احساس ہوتا کہ اختر موجود ہے، وہ کیاریوں میں پانی دینے یا گیلے کپڑے دیوار سے اُتارنے اس طرف آتی اور ماں کی نظریں بچا کر باہر جھانکا کرتی اور پھر جب کسی ان دیکھے لمحے میں اختر کی نگاہیں اس طرف اُٹھیں تو وہ جلدی سے دوسری طرف ہو جاتی۔

دروازے کے دوسری طرف اختر تھا جس نے تاج کے رنگدار آنچل کو بار ہا لہراتے دیکھا تھا اور چوڑیوں کی کنواری کھنک سنی تھی اور اس کے گھبرائے ہوئے قدموں کی آہٹیں محسوس کرلی تھیں لیکن اس کے سامنے تاج کی پوری تصویر نہیں آئی تھی صرف ایک دھندلا دھندلا سا نامکمل سا نقش تھا کیونکہ یہ دروازہ تو اسی روز سے بند ہوا تھا جب وہ اس برس اپنے دفتر کے ساتھ جموں چلا آیا تھا اور یہاں ان کے بالکل ساتھ والے فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔ دونوں کے درمیان صرف ایک دروازہ حائل تھا!!

اختر اپنے ساتھ کشمیر سے ایک نوکر لایا تھا جو اس کا کھانا بناتا تھا۔ گھر کی صفائی کرتا تھا اور چھوٹے موٹے کام کیا کرتا تھا۔ اس لڑکے نے اختر کو صرف اتنا بتایا تھا کہ ساتھ والے مکان میں تاج اور اس کی ماں کے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔ البتہ اس کا بیٹا کبھی کبھار آتا ہے لیکن وہ اپنی بیوی کے ساتھ دوسری جگہ رہتا ہے۔ اختر کو اکثر تاج کی ماں پر غصہ آتا کیونکہ اختر کی موجودگی میں کہیں بھی نہیں جاتی تھی حالانکہ نوکر نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر روز گھنٹے کے لئے وہ باہر جاتی ہے لیکن اختر کی موجودگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس کے خیالوں کی تصویر............تاج مکمل طور پر اس کے سامنے نہ آسکی۔

وادی کی گلفشاں پہنائیوں کی پروردہ ذات پتھروں کے دیش کی گرمی برداشت نہ کرسکی اور ایک صبح اختر کو کچھ کہے بغیر اس کا نوکر واپس کشمیر چلا گیا۔ شام کو جب تھک ہار کر واپس آیا تو بھوک بے تحاشا ستانے لگی۔ اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اُٹھ جاتیں تو اس کا جی چاہتا کہ کوئی اس کے پٹ کھول دے اور کھانے کی خوشبو جو دوسرے طرف قید تھی اُس کے پاس آنے دے!

بالآخر اس نے ہمت سے کام لیا اور دروازہ کھٹکھٹایا اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا لیکن سامنے یہ کون تھی، مشین پر چلتے چلتے یہ کس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ کون تھی جو ایک وحشی ہرنی کی طرح ٹھٹھک کر رہ گئی، میلی سی قمیض اور گلابی ڈوپٹہ میں چھپا یہ کس کا پیکر تھا، اس آنگن میں اُگے ہوئے اس پھول کو یہ دیواریں یہ دروازے کیوں اب تک چھپائے ہوئے تھے۔

''کیا ہے تاج''

''کچھ نہیں اماں......وہ......دروازے پر کوئی ہے۔''

یہ آواز اختر نے سنی اور کسی کو اپنی طرف آتے پا کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ آنے والا قریب پہنچ گیا ہے۔ اس نے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''میں اختر ہوں، میرا نوکر بھاگ گیا ہے، اس لئے............''

''کوئی بات نہیں، میں تو سمجھ گئی تھی کہ تم کہیں گئے ہو، ایسا بھی کیا تکلف کہ تم دن بھر بھوکے ہی رہے۔''

یہ تاج کی ماں تھی۔

''میں ابھی آتی ہوں'' یہ کہہ کر تاج کی ماں اندر چلی گئی۔

جتنی دیر اختر کو رکنا پڑا وہ بلائے جان ثابت نہیں ہوئی کیونکہ اب اسے بھوک کا احساس نہ تھا۔ شاید ایک پیاس، ایک تشنگی کا احساس تھا جو اس کی نگاہوں کو تاج کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے برتن واپس کرنے کے لئے دستک دی اور جب دروازے کے عقب میں اسے کسی کی موجودگی کی سرسراہٹ کا احساس ہوا تو اس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا، برتن لینے کے لئے اب جو ہاتھ بڑھے وہ تاج کی ماں کے نہیں تھے۔ وہ سپید سپید بانہوں والے حنائی ہاتھ تھے۔ مخروطی انگلیوں والے ہاتھ تھے۔ اس نے ان ہاتھوں کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا، ایک خواہش اس کے دل و دماغ میں سرایت کر گئی.....

کاش وہ ان ہاتھوں کو چھولے ...... لیکن ایسا ممکن نہیں ہوا۔ صرف چنداَن دیکھے آرزوں کا تبادلہ ہوگیا۔!!

نہ جانے وہ کب سوگیا۔

صبح ہوئی اور وہ بغیر ناشتہ کئے دفتر چلا گیا۔ وہ اس دروازے سے وابستہ ہر خیال کو بھلا چکا تھا۔ شام کو جب وہ دفتر سے واپس آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی دنیا میں آ گیا ہے۔ میز پر ناشتہ رکھا تھا۔ کمرے کی چیزیں سلیقے سے سنوری ہوئی تھیں۔ اس کے پہننے کے کپڑے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے، ناشتہ سرد ہو چکا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ ہلچل نزدیک ہی معلوم ہوئی۔

''جی'' کسی نے آہستہ سے کہا۔

''میں...... '' اختر رک گیا کیونکہ دوسری طرف تاج تھی۔'' میں واپس آیا تو یہ ناشتہ.....''

''آپ بغیر ناشتہ کئے چلے گئے، ہم لوگوں کو آج دیر ہوئی۔ امی کی طبیعت کچھ ناساز تھی اسی وجہ سے .... مجھے دیجئے میں گرم کئے دیتی ہوں۔''

پھر دروازے کے اوٹ سے وہی دو ہاتھ بڑھے۔

''آپ کو میری لاپروائی پر ترس آگیا، آپ نے میری چیزیں سنبھال کر رکھی ہیں۔ اماں کی طبیعت اب کیسی ہے۔''

''بخار ہے ڈاکٹر نے دوائی دے دی ہے۔''

''وہ لڑکا تو بھاگ گیا اب میں دوسرے نوکر کی تلاش میں ہوں۔''

''نہیں......''

''نہیں۔'' جیسے اختر کی دل کی دھڑکنیں رک گئیں۔ جیسے اس کے ذہن کی تاریکیاں پھر اس کے خیالوں کی شوخ کرنوں سے جگمگانے لگیں۔ کل رات سوتے وقت اس نے کچھ فیصلہ لیا تھا۔ اس نے سپنا بھی دیکھا تھا۔ سلمٰی...... لیکن تاج کے ایک لفظ ''نہیں'' میں کتنی ہاں پوشیدہ تھی، وہ نہیں چاہتی کہ نوکر پھر دوبارہ میرے کمرے میں آئے۔ آخر اس نوکر کی وجہ سے ہی تو یہ دروازہ اب تک بند تھا اب اگر اتفاق نے اسے کھول دیا ہے تو وہ نہیں چاہتی کہ یہ پھر سے بند ہو جائے۔

رات کو اچانک دروازے پر دستک سن کر اختر جاگ پڑا۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر لائٹ کو آن کیا اور گھبرا کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں............اماں کی طبعیت اچھی نہیں۔''

اختر اندر آیا۔ تاج کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ اختر نے پلنگ پر جھک کر اس کی ماں کا ماتھا چھوا اور جلد سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ماتھا آگ میں دہکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

''سنئے آپ کہاں ہیں۔''

''میں یہاں ہوں۔''

''اس وقت ڈاکٹر کا یہاں آنا مشکل ہے۔ آپ سرد پانی اور پھاہے

لا دیجیے۔"

تاج نے یہ چیزیں لا کر دیں اور اختر کی طرف دیکھا۔ تاج باہر اندھیرے میں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر اور سارے جسم پر روشنی کی پھوار برابر پڑ رہی تھی۔ اختر اس نظارے کی دل گرفتگی سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔

"آپ یہاں آ کر میری مدد کیجیے۔"

"جی"

"آپ یہاں آ جایئے، میں چلا جاتا ہوں۔"

"نہیں، خدا کیلئے آپ رکئے، میں تو بے حد گھبرائی ہوئی ہوں، آپ کی موجودگی سے مجھے سہارا مل رہا ہے۔"

"پھر آیئے نا۔"

اور پھر وہ پیکر روشنی میں نمودار ہوا۔ تاج ایسے چل رہی تھی جیسے ہلکورے کھاتی ہوئی ایک موج ساحل سے ملنے آ رہی ہو۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی گردن اوپر اٹھائی اور اختر کی طرف دیکھا پھر ماں کے سرہانے کی دوسری جانب بیٹھ گئی۔ چند لمحے بے عنوان گزر گئے!

"اماں کو ہوش آ رہا ہے، میں اب چلتا ہوں۔"

"آپ جا رہے ہیں۔" یہ شکوہ تھا یا رُک جانے کا پیغام۔ یہ چند الفاظ تھے یا محبت کی پوری تفسیر۔"

"آپ چاہتی ہیں کہ میں رک جاؤں۔"

چہرہ جھک گیا، قدم لوٹ آئے، ماں نے آنکھیں کھول دیں۔

''امی اب طبیعت کیسی ہے، میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا تھا۔تم بے ہوش تھیں......میری تو جان پر بن گئی تھی۔!!

صبح ناشتے کے لئے اختر کو وہیں جانا پڑا۔ اب ماحول شگفتہ تھا، مریض کی حالت سدھر گئی تھی۔

''ماں چائے تیار ہے۔'' اندر سے آواز آئی۔

''یہاں لے آؤ، اختر اپنا ہی ہے اس سے کیا پردہ۔''

تاج اندر آئی اور اختر کو لگا جیسے سورج کی پہلی کرن بڑے شرمیلے انداز میں سنورتی پھیلتی اس دھرتی پر اتر رہی ہو۔

اور جب اختر دفتر پہنچا، اس کے سامنے دو تصویریں تھیں۔

سلمیٰ............اور............تاج............!!

وہ زندگی کے اُس دوراہے پر آ گیا جہاں ایک راستہ محبت اور تعمیری زندگی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ہوس کی طرف پہلے راستے پر بیوی کی محبت اور آرزوں کا گھر تھا اور دوسرے راستے پر محض ایک رومانی کھیل، اُسے کس راستے کو اپنانا چاہئے وہ نہیں جانتا تھا۔

سلمیٰ اُس کی بیوی تھی جو تین سو کلومیٹر دور اس کے گھر میں اپنی آرزوؤں کی دنیا لئے اُس کی منتظر تھی شادی سے پہلے اس نے سلمیٰ کو دیکھا نہ تھا اختر کا جنم ایک ایسے خاندان میں ہوا تھا جو ساری وادی میں اپنی شرافت نیک نامی اور ایمانداری کے لئے مشہور تھا۔ والدین نے شادی طے کی اور

ہوگئی۔ سلمیٰ اُس کے گھر میں دلہن بن کر آئی۔ اُس نے اپنے ذہن میں خیالوں کو دنیا میں جس لڑکی کے خدوخال ابھارے تھے۔ سلمیٰ اُن سے زیادہ خوبصورت تھی...... چند ماہ سکون سے گذر گئے اختر کو سرینگر سے جموں آنا پڑا اس کا خیال تھا کہ نئی جگہ Settle ہوکر وہ سلمیٰ کو بھی لے آئے گا۔ مگر اب وہ کچھ اور ہی چاہ رہا تھا...... سلمیٰ اُس کی بیوی تین سو کلومیٹر دور تھی اور تاج صرف چند قدموں کے فاصلے پر.......... اور پھر اختر تو دل کا انسان تھا دل کے اشاروں پر چلتا تھا دل کائنات کا سارا حسن اپنے دامن میں سمٹنے کے بعد بھی پیاسا رہتا ہے۔ تشنگی کی کوئی حد نہیں ہوتی تمناؤں کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی..........!

تمناؤں کی آخری منزل کا ذکر ہی کیا...... اختر نے تو ابھی پہلی منزل میں ہی قدم رکھا تھا.......... ماں اب ٹھیک ہو چکی تھی اس لئے اختر کو تاج سے ملنے میں دقت ہو رہی تھی لیکن اُسکی غیر حاضری میں تاج اُس کے کمرے میں ضرور آتی اور اس کے ہاتھ بے ترتیب چیزوں کو قرینے سے رکھ دیتے قدرت نے سنوارنے کا سلیقہ ان عورتوں کو اس لئے دیا ہے کہ کائنات کا حسن قائم رہے مرد جس زمین پر آگ برساتا ہے عورت اُسی زمین پر محبت اور امن کے شگوفے کھلاتی ہے، وہ ازل سے ہی زندگی کو سنوارتی آئی ہے گھر کے آنگن میں پھول کھلاتی آئی ہے۔

اور اکثر بے قراری کے عالم میں اختر کی نظریں سلمیٰ کے فوٹو سے جاٹکراتیں اور اُس لمحے اُسے سلمیٰ بے ساختہ یاد آجاتی اور اُسی ایک لمحے میں وہ

خیالوں کی دنیا میں گم ہو کر سرینگر کی اُس بستی کی گلی کے نکڑ پر جا پہنچتا جہاں ایک چھوٹے سے مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں سلمٰی اکیلی تنہا نظر آتی لیکن یہ کہانی اب اختر کے لئے پرانی ہو چکی تھی، وہ گلیاں اس کے لئے اجنبی بن چکی تھیں اس نکڑ پر اگر کوئی صورت ابھرتی نظر آتی تو وہ تاج تھی صرف تاج لیکن وہ بھی کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی تھی حالانکہ اختر کے لئے کھانا تاج کے گھر سے ہی آتا تھا لیکن یہ کھانا اب تاج کا بھائی یعقوب لاتا تھا وہ اپنی بیوی سمیت ماں کے گھر آیا تھا عارضی طور پر چند دنوں کے لئے کسی اہم بات کے لئے لیکن اختر اس اہم بات سے بے خبر تھا۔

اس رات جب اختر گھر آیا تو یعقوب اُس کا منتظر تھا۔

''اماں آپ کو یاد کرتی ہے۔'' اختر نے کپڑے بدلے اور تاج کے ہاں چلا گیا۔

''بیٹا تم سے ایک بات کرنی ہے۔

اختر کے پاؤں تلے زمین سرک گئی اُس نے گھبرا کر کہا۔

''کیا''

''میں تاج کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی ہوں۔'' بے ساختہ سلمٰی کی تصویر اختر کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

''مگر میں.........''

''لڑکا مجھے پسند ہے'' اختر کی گھبراہٹ دور ہو گئی مگر پھر بھی وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکا۔

''آپ کی کیارائے ہے'' اچانک یعقوب نے پوچھا۔''

''میں ......میں......'' اور اس کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں دور سے کسی کی چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔

یہ تاج کے قدموں کی آہٹ تھی!!

یہ تاج کی چوڑیوں کی کھنک تھی!!

اختر کو محسوس ہوا جیسے یہ آہٹیں یہ سرسراہٹ، یہ کھنک اسے ایک سوال پوچھ رہی تھیں اس کی نگاہیں بار بار اُس سمت اُٹھنے لگیں جہاں سے یہ سوال اُبھرتا تھا اچانک تاج کی ماں نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

''لڑکا یہاں سرکاری مل میں کام کرتا ہے''

''اختر چونک پڑا۔'' کیا نام ہے اس کا''

''احسن''

چند روز بے عنواں گذر گئے اور ایک دن اختر دفتر سے تھکا ماندہ لوٹ آیا تو اس نے اپنے کمرے میں تاج کو دیکھا وہ بہت دنوں کے بعد اُس کے کمرے میں آئی تھی کمرے میں ہر شئے قرینے سے سنوری سجی تھی اور خود تاج کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی نہ جانے اپنی کس بے نام آرزو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''احسن کو میں جانتا ہوں، سیدھا سادہ معصوم سالڑکا ہے ابھی اس نے دنیا دیکھی نہیں ہے دنیاداری سیکھنی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارا سہارا پا کر وہ سب کچھ جان جائے گا۔''

تاج خاموش رہی!

''تم خاموش کیوں ہو کیا احسن سے یہ رشتہ......''

تاج نے اپنی نظروں کو جھکاتے ہوئے کہا............ ''تقدیر کی بات ہے میں تو......''

''تم نے جو سوچا تھا وہ.........'' وہ ایک لمحے کے لئے رُک گیا...... '' وہ تپائی پر پڑی تصویر دیکھ رہا تھا۔

تاج کی نظریں بے اختیار تصویر کی طرف مڑ گئیں۔

''تم نے پہلے بھی اس تصویر کو دیکھا ہوگا اور شاید سوچا ہوگا اس تصویر کے بارے میں جیسے میں نے کئی بار تمہارے بارے میں سوچا...... اب بھی سوچ سکتا ہوں لیکن تصویر میں جو لڑکی نظر آرہی ہے، یہ سلمیٰ ہے اور سلمیٰ میری بیوی ہے......!''

''کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

''ہاں میں نے کئی بار تم سے یہ بات کہنا چاہی مگر............''

''احسن بہت اچھا لڑکا ہے۔''

تاج نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی تاج کی ماں نے بہت ساری ذمہ داریاں اختر کے کندھوں پر ڈال دیں وہ دفتر سے لوٹتا اور شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا۔

احسن سیدھا سادہ معصوم سا لڑکا تھا کشمیر کے کسی دور دراز علاقے

سے تعلق رکھتا تھا کام کی تلاش میں دس برس پہلے یہاں آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا تھا اپنی محنت اور افسر کی عنایت سے فیکٹری میں سب انسپکٹر بن گیا تھا۔

احسن دولہا بن کر آیا اور بادامی آنکھوں والی تاج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی بن گئی......شادی کے ہنگامے آہستہ آہستہ کم ہونے لگے اور ایک دن احسن اپنی بیوی اور ساس کو لے کر دوسرے مکان میں چلا گیا اس شام جب اختر دفتر سے لوٹا تو کمرے کی دیواریں خالی خالی نگاہوں سے اپنی ویرانی پر رو رہی تھیں......اختر کا ساماں بھی نئے مکان میں منتقل کیا گیا تھا۔

احسن نے کہا ''تم میرے دوست ہو تم نے مجھے سہارا دیا اس سہارے کی مجھے اب بھی ضرورت ہے۔''

تاج کی ماں نے کہا۔''میرا ایک ہی بیٹا ہے یعقوب لیکن وہ میرے ساتھ نہیں رہتا آیا تھا شادی میں ایک مہمان بن کر......... چلا گیا اپنے گھر اپنی بیوی کے پاس......اب تم میرے بیٹے ہو تم میرے ساتھ......ہم سب کے ساتھ رہو گے۔تاج نے کوئی بات نہ کہی لیکن اُس کے خاموش ہونٹوں پر جیسے کوئی خاموش سا پیغام پوشیدہ تھا۔

اختر نے کوئی جواب نہ دیا......احسن نے اُسے دوست کہا تھا اور ماں نے اُسے بیٹا کہا تھا۔

اور تاج.........اُس کی بے زبانی اختر کی زبان بن گئی تھی۔

نیا مکان پرانے مکان کی نسبت بہتر تھا تین کمرے تھے ایک کچن تھا

اور سامنے کھلا کھلا آنگن ،شروع میں جو کمرہ تھا وہ ذرا چھوٹا تھا لیکن باقی دو کمروں سے خوبصورت تھا آنگن کی طرف دو کھڑکیاں کھلتی تھیں جن سے ہوا اور روشنی اندر آتی تھی اختر کو یہی کمرہ دیا گیا نئے مکان میں چند دن گہما گہمی رہی۔ شادی بھی نئی نئی ہوئی تھی۔ اپنے بیگانے ایسے موقعوں پر آتے رہتے ہیں۔اُن کے ہاں بھی چند روز آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہا............!!

اختر اب نہ جانے کیوں خاموش خاموش سا رہنے لگا تھا!

تاج جب بھی اختر کے لئے کھانا لے کر آتی تو اختر ایک بے چینی سی محسوس کرتا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب تاج اُسکی موجودگی میں کسی بھی بہانے اسکے کمرے میں آیا کرے وہ تاج سے دور رہنا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل کی کوئی کمزوری اس کی سوچوں پر غالب ہوجائے ،وہ تو دل کا انسان تھا اور دل کا انسان بے حد جذباتی ہوتا ہے لیکن تاج تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آجاتی اور کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے قراری پھوٹ پڑتی اور جب وہ کئی لمحے اختر کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تو اختر کو اپنا دل کسی گہرے ساگر میں ڈوبتا نظر آتا.....تاج کی آنکھیں کافی گہری تھیں..........ساگر جیسی گہری آنکھیں!!

اختر محسوس کر رہا تھا کہ تاج احسن میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی ہے احسن کی آمدنی کافی تھی اگر چہ تنخواہ درمیانی درجے کی تھی۔لیکن بالائی آمدنی بہت زیادہ تھی اور وہ اپنی بالائی آمدنی سے بیوی کی ضروریات پر بے تحاشا روپیہ لٹا رہا تھا.....!

سلمٰی اس کی بیوی تھی لیکن اس کی نظروں سے بہت دور!

تاج اس کے دوست کی بیوی تھی لیکن اس کی نظروں کے سامنے!!

دونوں عورتیں تھیں لیکن دونوں میں کس قدر فرق تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ آجائے کہ وہ......؟ وہ اپنے ذہن کو مقفل کرنے کی کوشش کرتا لیکن ایسا کرنا اس کے لئے ناممکن بنتا جارہا تھا اس کا وحشی دل اس کی سوچوں میں ایک اضطراب سا پیدا کر رہا تھا جس کا حل......یا جس کی آخری منزل......وہ اس بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا......یہ کیسی عورت ہے کیسی محبت ہے کیسی تشنگی ہے احسن کو دیکھ کر یہ عورت برف کا تودہ بن جاتی ہے......؟!

اچانک اختر کو احساس ہوا کہ اُس کی قمیض کی جیب میں کچھ رکھا ہوا ہے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کاغذ کا ایک بڑا سا ٹکرا ملا اُس نے کھول کر دیکھا، لکھا تھا......'' دنیا کی ہر شئے اپنے وجود کا اظہار چاہتی ہے۔، پھول اپنی خوشبو اس لئے بکھیرتے ہیں کہ کسی کا دماغ معطر ہو، سمندر کی لہریں اس لئے اُمڈ اُمڈ کر آتی ہیں کہ کنارے کے دل میں گڑ گڑاہٹ ہو، بادل اس لئے گرجتے ہیں کہ دھرتی کے سینے میں اپنے آپ کو گم کردیں۔ازل سے اب تک یہ سلسلہ رواں دواں ہے محبت کا اظہار انسانی تہذیب کی عظمت ہے، مزاج ہے، سربلندی ہے پھر محبت کے اظہار پر پابندیاں کب تک!

اختر نے اس مختصر سی تحریر کو کئی بار پڑھا لیکن خاموش رہا۔

ایک دن ایک اور تحریر ملی......'' آپ کے بغیر میری زندگی نامکمل

ہے، مجھے اپنے ہر خیال اپنی ہر سوچ پر آپ ہی آپ نظر آتے ہیں، ۔ میری زندگی کی تکمیل کے لئے میرے دل کی گہرائیوں کا اندازہ لگا لیجئے۔ میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔

اور اختر نے جواب میں لکھا۔ ''تم نے شاید اندازہ کرلیا ہوگا کہ میں ایک جذباتی انسان ہوں اور جذباتی انسان ہر ہر لمحہ مرتا ہے اپنے دل کی کمزوریوں کی وجہ سے ....سوچ رہا ہوں میں تمہاری جانب جھکا ہی کیوں .....تم احسن کی بیوی ہو اور احسن کو اپنانا تمہارا فرض ہے!!

اختر خط لکھ ہی رہا تھا کہ تاج کمرے میں آگئی۔ اس نے اختر کے ہاتھ سے کاغذ چھینا اور پڑھنے لگی۔ اور پڑھ بے تحاشا رونے لگی۔

''تم رو کیوں رہی ہو تاج۔''

''تاج نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر چلی آئی۔''

اختر نے اپنی ہی تحریر کو کئی بار پڑھا اور پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

اور اس شام بھی اس کمرے کا دروازہ بند تھا وہ اپنے بستر میں لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا تاج کی ماں اپنے بیٹے یعقوب کو دیکھنے گئی تھی۔ چند دنوں سے بیمار تھا۔ دستک کی آواز نے اختر کو چونکا دیا۔ وہ اپنے بستر سے اُٹھا اور دروازہ کھول دیا، دروازے پر تاج کھڑی تھی اس کی آنکھیں کچھ بھاری سی تھیں۔

''اندر آنے کے لئے نہیں کہو گے'' تاج نے پوچھا

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ یہ تو تمہارا ہی گھر ہے۔' میں تو صرف ایک مہمان ہوں۔'' تاج کمرے کے اندر آئی۔

''تم رو کیوں رہی ہو''

''بس یونہی'' اور پھر جیسے تاج کے من میں ایک سیلاب اُمڈ آیا۔'' میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔''

''دیکھو میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔''

''سچ''

''لیکن میری بات تو سنو میرے لئے پیار ایک جذبہ ہے پاک اور مقدس جذبہ اور تم بھول رہی ہو کہ تم بھی شادی شدہ ہو اور میں بھی۔''

تاج پھر رونے لگی، اختر ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا اور اس کشمکش میں وہ تاج کے قریب آیا اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا۔

''مجھے سمجھنے کی کوشش کرو تاج۔''

اور تاج نے کوئی جواب نہ دیا اور اختر سے لپٹ گئی۔ ''تم وحشی ہو اختر۔ وحشی تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔''

اور اسی ایک لمحے میں سلمیٰ اختر کی سوچوں سے کہیں دور چلی گئی اور تاج اس کی سوچوں پر حاوی ہو گئی اور اب اس کے سامنے تاج کی زلفوں کی خوشبوئیں اور چہرے کے دہکتے ہوئے خطوط تھے اور پھر نہ جانے کیسے اس نے تاج کے دل کی تاروں پر انگلیاں رکھ دیں جس میں سے ایک ایسا نغمہ نکلا جس نے دونوں کو سرشاری اور بےخودی بخش دی۔

تاج نے خود سپردگی کے انداز میں کہا۔ ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی میں جانتی ہوں کہ تم شادی شدہ ہو میں تمہیں اور صرف تمہیں پانے کے لئے احسن سے شادی کی۔''

اور پھر لمحے تاریک تر ہوتے گئے اور ان تاریک لمحوں میں اختر تاج کی زندگی میں پڑے ہر نقاب کو اُلٹتا چلا گیا۔

''یہ میں نے کیا کیا۔'' اُس نے تاج سے پوچھا۔

''کچھ نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا، صرف ہمارے محبت کا رشتہ ابدی ہوگیا ہے اب اسے کوئی نہ توڑ سکے گا۔''

دوسری صبح اختر کو چھوٹے بھائی کا خط ملا لکھا تھا۔

''بھائی جان آپ کو جان کر مسرت ہوگی کہ میں چاچا بن گیا ہوں' آپ کب آرہے ہیں؟ بھابی آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔''

خط پڑھنے کے بعد اختر کی نظروں کے سامنے معصوم سے ننھے منے نوازئید بچے کی تصویر گھومنے لگی وہ اُسے دیکھنا چاہتا تھا اور اس نے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا، دفتر میں چھٹی کے لئے درخواست دی، چھٹی فوری طور منظور ہوگئی اور اب وہ جانے سے پہلے سلمٰی کے لئے کوئی اچھا سا تحفہ خریدنا چاہتا تھا۔ بازار میں گھوم گھوم کر اس نے سلمٰی کے لئے ایک بڑھیا سا قیمتی سوٹ خرید لیا ختائی رنگ کا سوٹ اسی رنگ کی سینڈل اور خوبصورت سا ہار۔!!

''کیا لائے ہو'' اختر کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ دیکھ کر تاج نے پوچھا تاج نے ایک ایک چیز کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک

نظر آنے لگی۔

''کس کے لئے ہیں یہ سب چیزیں؟''

اختر سلمیٰ کا نام لیتے لیتے رک گیا............''یہ تو......یہ میں......

''کہوں بھی نا۔''

''یہ سب تمہارے لئے تاج'' یہ کہتے ہوئے وہ لرز سا اُٹھا شاید اِسی ایک لمحے میں سلمیٰ اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں گم ہو چکی تھی۔ یہ سب چیزیں لے کر تاج کمرے سے باہر چلی گئی اور جب وہ لوٹ کر آئی اس نے نیا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہار لرز رہا تھا'' کیسی لگ رہی ہوں۔'' وہ اختر کے قریب آئی'' بہت سندر۔'' تو پھر یہ ہار میرے گلے میں پہنا دو'' اس نے ہار اختر کی جانب بڑھا دیا۔

اپنا چہرہ اوپر اُٹھاؤ۔ اس کے سینے پر ڈوپٹہ کانپ رہا تھا اختر نے ہار کے دنوں سرے پکڑے اور جب اس کے بانہوں کا حلقہ بڑھا تو تاج اس کے اور قریب آ گئی۔ اتنی قریب کہ.......... اختر نے اس کے سینے اور سر سے ڈوپٹہ ہٹا کر ہار پہنا دیا اور جب اس کی انگلیوں نے تاج کی گردن کے خم کو چھوا، بالوں کو چھوا تو تاج میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اختر خود بھی کسی ان دیکھی دنیا میں کھو گیا۔'' ......تاج۔!!

اس کے بعد بے خود ایک ایسا عالم آیا کہ تاج اختر سے لپٹ گئی جیسے بیلیں محرابوں سے لپٹ جاتی ہیں پھر بے خودی کا یہ عالم ٹوٹ گیا، اس نے اپنے آپ کو جدا کیا اپنے لباس کے شکن کو دور کرنے کی کوشش کی، بالوں کو

سنوارا، ڈوپٹے کو سر پر رکھا اور تیزی سے باہر چل دی، وہ اچانک گھبرا اُٹھا۔ ''احسن تاج کو ان کپڑوں میں دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔'' اختر کی نظروں کے سامنے دوستی کی پستیاں اور بلندیاں گھومنے لگیں، پست کون تھا اور بلند کون تھا۔ اختر، تاج یا احسن.........کون کسے دھوکہ دے رہا تھا کون کس کو اپنا رہا تھا یہ ایک مثلث بن گیا تھا، تینوں اس مثلث کے حصے تھے۔ برابر حصے......!!

دوسری صبح اس کی گھبراہٹ بالکل دور ہوگئی، احسن تاج سے کہہ رہا تھا۔ ''اختر نے تمہارے لئے جو کپڑے خریدے ہیں تم اُن میں بہت سندر لگتی ہو۔''

یہ کیسا خاوند تھا۔

یہ کیسا دوست تھا!!

اور اب شاید سلمیٰ کی تصویر اختر کے ذہن سے اُتر گئی تھی لیکن اس کی چھٹی منظور ہو چکی تھی اور اس کا گھر جانا ضروری بنتا جا رہا تھا۔ سلمیٰ کے لئے اپنے نوازئیدہ بچے کے لئے ماں اور چھوٹے بھائی کے لئے......!!

اختر پر یہ کیسا جادو چل گیا تھا کہ تاج کو دیکھتے ہی سلمیٰ اُس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے گم ہو جاتی۔ سلمیٰ اس کی بیوی تھی اس کے بچے کی ماں اور تاج...... سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف جسمانی رشتہ

شہر پرانا تھا لیکن ماحول نیا تھا!

گھر پرانا تھا لیکن درو دیوار نئے تھے۔!!

تین برس قبل کی وہ شام سلمیٰ کو اب بھی یاد تھی۔ جب اُس نے اپنی

ماں کا گھر چھوڑا تھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اختر کے گھر آ گئی تھی۔ اس کے خیالوں کا گھر، اُس کے خوابوں کا گھر لیکن اب یہی گھر اس کے لئے اجنبی بنتا جا رہا تھا۔ اختر بھی کافی بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی تازگی نہ تھی۔ وہ پہلی سی حرارت نہ تھی وہ پہلا والہانہ پن نہ تھا، وہ خاموش خاموش رہتا، اسے بات بات پر غصہ آتا اور دور خلاؤں میں جیسے کچھ تلاش کرتا رہتا تھا اور سلمیٰ جسے وہ پیار کرتا تھا جو اس کی زندگی میں بہار کا پہلا پھول بن کر آئی تھی اس تبدیلی سے حیران ہو رہی تھی۔ شاید محبت کی ساری شمعیں گل ہو چکی تھیں، اختر کے دل میں ایک نئی شمع جگمگا رہی تھی اور پتھروں کے اوٹ سے ایک نیا سورج اُگ آیا تھا۔ تاج دور ہو کر بھی اب کتنی قریب تھی۔ تاج نے کہا تھا۔

''لوٹ کر کب آؤ گے؟''

''جب تم یاد کرو گی''

''تم نہیں جانتے کہ میں تمہارے بغیر کس قدر ادھوری ہوں، کس قدر نامکمل ہوں۔''

اختر نے کہا، ''ہر محبت کی تصویر اسی طرح بنتی ہے، پہلے نقش ابھرتے ہیں، پھر رنگ بھرے جاتے ہیں، ایک ساتھ تو تصویر مکمل نہیں ہوتی۔''

اس رات وہ محبت میں ڈوبے رہے۔ آرزوؤں کو پناہ ملتی رہی اور رات کا ہر لمحہ مسکراتا رہا۔ احسن کی سادگی اور خاموش پر اختر کی دوستی اور تاج کی بے وفائی پر۔ شاید احسن نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا!

ادھر اختر اب اپنے گھر میں تھا۔ اپنے افراد خانہ کے ساتھ، سلمیٰ خاموش تھی اور حیران بھی ...... اپنے دل کا حال کیسے بتاتی، درد دل کا علاج کرنے والا خود کہیں اور تھا، کوئی اور روگ اپنا لیا تھا اُس نے۔ اختر کے چھوٹے بھائی نے کئی بار اپنی بھابی سلمیٰ کو روتے ہوئے دیکھا، اس نے اپنی ماں سے اس کا ذکر کیا، ماں خود بھی اختر کے موجودہ رویئے سے خوف زدہ تھی۔ اور سلمیٰ کے آنسوؤں کی کہانی لکھنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر وہ یہ کہانی سارے گھر میں پھیل گئی لیکن گھر کا ہر فرد یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر وہ کون سی دیوار ہے جو اختر اور سلمیٰ کے درمیان کھڑی ہوگئی ہے۔ آخر ایک دن یہ راز خود بخود عیاں ہوگیا، تاج کا خط تھا جو اختر کے بھائی کے ہاتھ لگا۔ تاج نے لکھا تھا۔! سارا سارا دن اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے پلنگ پر لیٹی تمہاری یاد میں کھوئی رہتی ہوں میرے لئے انتظار جان لیوا بنتا جا رہا ہے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ تم باہر آنگن سے بلا رہے ہو.......... بار بار دروازے تک جاتی ہوں کھڑکی سے جھانکتی ہو مگر ہر بار مایوس ہوتی ہوں!

اس روز گھر میں ایک ہنگامہ ہوا، اس کی بیوی سلمیٰ روتی رہی ماں بھی روتی رہی اور اختر اس ہنگامے کے اس قدر قریب ہونے کے بعد بھی کتنا دور تھا اور شاید..... شاید تاج اس کی نس نس میں سما چکی تھی۔! اور سلمیٰ اپنے نوازئیدہ بچے کو لے کر جا رہی تھی اپنی ماں کے پاس اپنی ماں کے قدموں میں .... سلمیٰ گھر سے بے گھر ہوگئی اور یہ سب کچھ اختر خاموشی سے دیکھتا رہا! دوسرے روز اختر کسی سے کچھ کہے بغیر اپنے گھر سے چل دیا اس دوسرے

گھر کی جانب جہاں تاج رہتی تھی۔

''تم نے یہاں آکر میرے ساتھ ایک..........!''

''کیا کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ۔''

''کچھ نہ پوچھو میرے محبوب مجھ سے۔''

''آخر بات کیا ہے؟''

''میری گود..........''

''میں کچھ نہیں سمجھا۔''

''میری کوکھ میں تمہارا بچہ ہے۔''

''بچہ''

''ہاں تمہارا بچہ۔ احسن دنیا کی نظروں کے سامنے میرا خاوند ضرور ہے لیکن یہ بچہ تمہارا ہے۔ یاد کرو وہ دن جب تم اور میں ایک ہو گئے تھے۔ بس وہ دن اور یہ لمحہ۔ احسن سے میرا کوئی تعلق نہیں، نہ روحانی، نہ ذہنی اور نہ ہی جسمانی، میں اُسے اپنے جسم کو چھونے تک نہیں دیتی میں تمہاری ہوں اختر......!!

اختر لرز اُٹھا۔ ایک سلمیٰ ہے جو اب بھی شرعی اور قانونی طور پر اختر کی بیوی ہے اور جس کی گود میں اختر کا بچہ ہے۔ ایک تاج ہے جو کسی اور کی بیوی ہے لیکن جس کے کوکھ میں اختر کا بچہ ہے.......... دو بچے دو مائیں اور ایک باپ!

پھر ایک مثلث وجود میں آیا، مثلث کے تین کونے۔ تاج، سلمیٰ اور اختر!!! اگلی بار جب اختر دوبارہ اپنے گھر آیا، اپنی ماں اور بھائی سے ملنے کے

لئے تو وہ تنہا نہ تھا۔ تاج اور احسن اس کے ساتھ تھے لیکن وہ اختر کے ہاں نہیں ٹھہرے بلکہ اختر نے اُن کے لئے کسی اور جگہ کسی دوست کے ہاں رہنے کا انتظام کرلیا تھا۔ احسن اپنے گاؤں چلا گیا اپنوں سے ملنے کے لئے، کئی سال بعد وہ اپنوں سے ملنے کے لئے آیا تھا اور تاج ...... اپنی محبت کو نیا رنگ، نیا روپ دینے میں مصروف تھی۔

اور ادھر اختر کو اپنے گھر میں ایک عجیب سے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ سلمیٰ اب بھی ماں کے پاس تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید اختر اسے ملنے آئے گا، اسے لے جانے آئے گا۔ اپنے بچے کو دیکھنے آئے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ماں نے کئی بار اختر کو سسرال جانے کے لئے کہا۔ مگر وہ انجان بنا رہا، وہ سب کچھ سمجھ کر بھی جیسے کچھ بھی نہ سمجھ رہا تھا، پھر ماں نے کھل کر بات کی

''آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''تم اپنا گھر بسا کیوں نہیں لیتے۔''

''کون سا گھر .... میں تو اپنے گھر میں ہی رہتا ہوں۔''

''اور تمہاری بیوی۔ تمہارا بچہ؟''

''سلمیٰ'' وہ رُک گیا اور پھر آہستہ سے کہا ''ماں ہم اکھٹے نہیں رہ سکتے، ہم دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔''

''لیکن کیوں ...... کیسے''

''اس کا جواب خود میرے پاس نہیں ہے۔''

"سلمیٰ کا آخر قصور کیا ہے؟"

اس کا کوئی قصور نہیں سارا قصور میرا ہی ہے"

ماں کو غصہ آیا۔ "کون ہے وہ چڑیل جس کی وجہ سے تم اس گھر کو آگ لگانا چاہتے ہو"

"ماں"

"میں ٹھیک ہی کہتی ہوں وہ ضرور کوئی ڈائن ہوگی"

"تمہیں اس کے بارے میں کچھ کہنے کا حق نہیں بنتا"

آج پہلی بار اختر ماں کے ساتھ ایسے پیش آیا تھا اُسے اپنی غلطی کا احساس تو ہوا لیکن الفاظ زبان سے نکل چکے تھے، تیر ترکش سے باہر آچکا تھا اور ماں کا دل چھلنی چھلنی ہو چکا تھا۔

دیکھ لوں گی میں اُس ڈائن کو...... میرے گھر کو آگ لگانے والی کو۔ کہاں چھپا رکھا ہے تم نے اُسے؟"

اختر نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلا آیا۔ لیکن محبت کی باتیں چھپائے نہیں چھپتی، یہ ایک ایسی داستان ہے جو نگاہوں میں دہرائی جاتی ہے۔ خوابوں میں پروان چڑھتی ہے، اختر کی نگاہیں اس داستان کو کیسے چھپاتیں اور یہ داستان سارے گھر میں پھیل گئی کہ وہ عورت ان دنوں اسی شہر میں ہے جس نے ایک چنگاری کا روپ اپنا کر اس گھر اس خاندان میں آگ لگادی تھی ایک دوسرے عورت کی دنیا لٹادی تھی اپنی ہوس بجھانے کے لئے!!

اور اس رات اختر کے گھر میں جیسے ایک بم پھٹ گیا، ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ ساری خاندانی شرافت، ایمانداری اور روایات اس دھماکے کی نذر ہو گئیں!!

میں سلمیٰ کو طلاق دے رہا ہوں

یہ بات سلمیٰ نے بھی سنی، وہ مظلومیت اور معصومیت کی تصویر بنی رہی، اس کا سارا وجود آنسوؤں میں تحلیل ہو کر بہہ گیا اور جیسے بے موت مرگئی۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے بہتر زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ اُس نے دیکھا تھا کہ اس کا اپنا ایک گھر ہے جس کے آنگن میں محبت کے شگوفے کھل اُٹھے ہیں۔ لیکن جب آنکھ کھلی اور سپنا ٹوٹ گیا تو اسے ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ وہ سوچ رہی تھی جب اس کا بیٹا بڑا ہوگا اور اسے پوچھے گا۔

''امی پاپا کہاں ہیں تو وہ کیا جواب دے گی''

ماں جو حیات کا سرچشمہ ہے اپنے لہو سے زندگی کی کھیتی کو سینچتی ہے۔ پودوں کو بڑا کرتی ہے لیکن اپنے شریک حیات کے بغیر کس قدر ادھوری اور نامکمل ہے!!

طلاق ہو گئی! اب سلمیٰ نہ لٹی تھی بلکہ ایک ماں کے بے شمار، انگنت اور اَن دیکھے خواب لٹ چکے تھے۔!! سلمیٰ اور تاج۔ ایثار کے آنسو اور جوانی کا خون...... دونوں میں کتنا فرق ہے۔!!

اور پھول سے اُس کی ساری خوشبو چھین لی گئی اور اُسے مسل کر باہر پھینک دیا گیا اور سلمیٰ ہمیشہ کے لئے گھر سے بے گھر ہو گئی۔

اپنے جسم کی طرح اُس کا نام بھی طویل تھا لیکن اب وہ صرف میر صاحب کے نام سے پہچانا جاتا تھا وہ زمانہ گذر چکا تھا جب وہ ایک فیکٹری میں معمولی سی اُجرت پر کام کرتا تھا اب اس کے پاس شہر کی وسط میں ایک شاندار کوٹھی تھی، اس کے پاس نوکر چاکر تھے کار تھی، اس کے بچے شہر کے سب سے اچھے سکول میں پڑھتے تھے۔ میر صاحب کا اپنا ایک وسیع کاروبار تھا کبھی جس فیکٹری میں وہ معمولی سی اجرت پر کام کرتا تھا، اب وہ اس اور دوسری فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کا رہنما تھا۔

اختر میر صاحب کو بخوبی جانتا تھا اور ایک دن اُسے احسن کے ہاں دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ احسن اور میر صاحب کا کیا تعلق ہے اور ان تعلقات کا فوراً ہی پتہ چلا گیا میر صاحب اور احسن نے مل کر اس فیکٹری سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ دونوں معمولی ورکر تھے۔ پھر احسن نے وہ ملازمت چھوڑ کر کسی اور فیکٹری میں ملازمت اختیار کی تھی! اور آج یہی میرِ صاحب احسن کے ہاں مدعو تھے!!

کئی رنگ بدلے کئی موسم بدلے اور وقت ایک سبک رفتار ہرنی کی طرح چھلانگیں لگاتے ہوئے تاج اور اختر کی زندگیوں کے آنگن سے گذرتا رہا، تاج کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر ایک اور لڑکی پیدا ہوئی لیکن وہ اب بھی تشنہ تھی، پیاسی تھی وہ چاہتی تھی کہ اس کا اپنا ایک خوبصورت سا بڑا سا مکان ہو جس کے آنگن میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوں جس کی دیواروں پر نقش کاری کی گئی ہو جس کے فرش پر ایرانی قالین بچھے ہوں جس کی کھڑکیوں پر

نیلے رنگ کے پردے لٹک رہے ہوں۔ اس کے دل میں ایک اور آرزو انگڑائیاں رہی تھی اس کا من کرر ہا تھا کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ اور اختر سے اس نے کئی بار اس نئے مکان کی باتیں کی تھیں۔ بیٹا پانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن یہ اختر کے ہاتھ میں نہ تھا۔ جب وہ بیٹے کی بات چھیڑتی تو اختر کو اپنے بیٹے کی یاد آجاتی۔ ہاں بیٹا جس کی اختر نے صورت بھی نہ دیکھی تھی۔!!

ٹھہریئے! ذرا میری طرف دیکھ لیجئے۔ آپ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ میں کہاں سے اس کہانی میں آٹپکا، ابھی بتائے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں اور اس کہانی سے میرا کیا تعلق ہے۔ دیکھئے میں اپنا نام بتانا ہی بھول گیا۔ میرا نام اختر ہے اور یہ میری کہانی ہے! لیکن ابھی یہ کہانی ختم نہیں ہوئی کہانی تو اب شروع ہوئی ہے محبت جو نگاہوں میں دہرائی جاتی ہے خوابوں میں پروان چڑھتی ہے اور جس سے تاج اور میں نے مل کر ابدیت بخشی تھی کیا اس طرح مٹ سکتی ہے!

لیکن میں تو............کیا میں اب بھی تاج سے محبت کرتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ تو میرے من میں یہ کیسی بے قراری ہے۔ میرے دل میں یہ کیسی تڑپ ہے جب اس کی یاد شدت اختیار کرنے لگتی ہے تو میں کیوں شراب کا سہارا لیتا ہوں۔

اور تاج ...... اُس کے پاس ایک خوبصورت مکان ہے، مکان کی باہری دیواروں پر عشق پیچان کی بیلیں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہیں آنگن میں رنگ برنگے پھول ہیں فرش پر قالین بچھے ہیں۔ اس کی گود میں ایک لڑکا

ہے۔ بہت ہی سندر بیٹا......اور اُس بیٹے کی شکل صورت......!

میر صاحب!

یہ مکان بھی میر صاحب نے بنوایا ہے میں تو اُسی روز جان گیا تھا کہ کوئی دھماکہ ہونے والا ہے جب میر صاحب نے احسن کے گھر روز آنا شروع کر دیا تھا اور تاج صبح سے ہی بن سنور کر اُس کا انتظار کرنے لگی تھی، میں نے کئی بار تاج سے کہا بھی تھا کہ مجھے میر صاحب کا یہاں آنا پسند نہیں۔

''اختر میر صاحب بہت ہی شریف اور نیک انسان ہیں، اُن کے یہاں آنے سے ہم لوگوں کو کوئی فائدہ ہوتا ہے پھر اعتراض کیوں اور کس لئے؟

''کیسا فائدہ''

''احسن کی ترقی''

اور اس روز احسن کی ترقی کے بارے میں سن کر مجھے اپنے ہوش اُڑتے ہوئے نظر آئے احسن جس سے تاج شدید نفرت کرتی تھی۔ اس قدر نفرت کہ وہ اپنے گھر میں ایک اجنبی کی طرح رہ رہا تھا اور اب تاج اس احسن کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھی......اور پھر میں نے وہ بھی دیکھا یا جس کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا میں نے تاج کو میر صاحب کے گھر کے اندر جاتے دیکھا، کچھ دیر کے بعد میر صاحب کا نوکر باہر آیا اور بیرونی دروازے بند کر کے اس پر تالا چڑھا لیا جیسے گھر میں کوئی نہ ہو...... یہ سب دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے سارے ارمان بکھر بکھر کر فضاء میں تحلیل ہو چکے

ہوں، اب میرا اپنا کوئی وجود نہیں۔

اُس رات میں خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا دروازہ بند نہیں تھا میرا ہاتھ لگتے ہی کھل گیا میں نے دروازہ بند کر کے روشنی کے لئے سوئچ آن کیا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ میں کمرے سے باہر آیا اور تاج کی ماں سے پوچھا۔

''تاج کہاں ہے''

''دعوت پر گئی ہے۔''

''کہاں''

''میر صاحب ہاں''

''اور میرے کمرے کی چیزیں''

''ہاں ہاں تاج کچھ تلاش کر رہی تھی۔''

میں کمرے میں لوٹ آیا۔ تاج وہ سارے خطوط میری اٹیچی سے نکال چکی تھی جو اس نے مجھے لکھے تھے اور وہ تصویریں بھی جن میں ہم دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ چند روز میں خاموش رہا اور حالات کا جائزہ لیتا رہا ایک دن مجھ سے برداشتہ نہ ہو سکا اور تاج سے کہا ''تاج میں دیکھ رہا ہوں کہ تم......''

تم سے دیکھا نہیں جاتا تو یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے اس نے میری بات کاٹ کر کہا میرا ہاتھ اُٹھا، تاج فرش پر گری پڑی ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ اس ہنگامے میں تاج کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ ''نکل جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ''

آنسو تھم چکے ہیں! طوفان شانت ہو چکا ہے اور میں اپنے گھر میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہوں اب آنچل میں رنگ نہیں، چوڑیاں میں کھنک نہیں دبے دبے قدموں کی آہٹیں نہیں وہ دروازہ ٹوٹ چکا ہے جو نگاہوں کا جلوہ گا بنا ہوا تھا۔

وہ ایک خواب تھا جو میں نے آٹھ برس سوتے جاگتے دیکھا جس نے میری زندگی کا سارا سکون میرے من کی ساری شانتی مجھ سے چھین لی یہ کیسی نیند تھی جس نے مجھ سے میرے اپنے چھین لئے، اُن سب کو میرے لئے بیگانہ بنا دیا۔ اور جب نیند ٹوٹی اور میں خواب سے جاگا تو میں نے اپنے کندھے پر دو نرم نرم ہاتھوں کی شفقت محسوس کی، میں نے ہڑبڑا کر دیکھا اور اپنی ماں سے لپٹ گیا، ماں کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے میرے بیٹے۔ جا کر اپنے بیٹے کو اپنا لو.........اُسے اپنے گھر لے آؤ۔''

''میرا بیٹا۔ میرا اپنا بیٹا مجھ سے پوچھے گا، ''پاپا تم نے امی کو گھر سے کیوں بے گھر کر دیا۔ کیوں اسے طلاق دی۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا' میرے پاس تو اس کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔!!''

❁❁❁

نور شاہ کی دوسری کتابیں

- بے گھاٹ کی ناؤ — افسانے
- نیلی جھیل کالے سائے — ناول
- ویرانے کے پھول — افسانے
- من کا آنگن اُداس اُداس — افسانے
- پائل کی زنجیر — ناول
- آؤ سو جائیں — ناولٹ (ناولٹ نمبر شاعر ممبئی)
- انتخاب اردو ادب — (ریاست جموں و کشمیر۔ 1947 سے 1971 تک ایک جائزہ)
- گیلے پتھروں کی مہک — افسانے
- آدھی رات کا سورج — ناولٹ (ہفتہ وار احتساب سرینگر میں قسط وار شائع ہوا)
- لمحے اور زنجیریں — ناولٹ (ہفتہ وار صدرنگ سحر سرینگر میں قسط وار شائع ہوا)
- بے ثمر سچ — افسانے
- بند کمرے کی کھڑکی — ڈائری کے اوراق پر مشتمل رفتہ رفتہ یادیں
- کہاں گئے یہ لوگ! — ادبی خاکے
- آسمان پھول اور لہو — افسانے

زیر اشاعت

- برف اور سناٹے — ناول
- بارش کا پہلا قطرہ — ڈرامے
- نور شاہ....فن اور شخصیت — مرتبہ :۔ رؤف راحت

NOOK SHAH KAY TEEN NOVEL

By Edited

Rouf Rahat









میزان پبلشرز

ہمارے اغراض ومقاصد

اردو اور کشمیری زبان وادب کا ارتقا اور استحکام

دوسری زبانوں کے ادب پاروں کا اردو اور کشمیری میں ترجمہ اور ان کی اشاعت

اردو اور کشمیری شہہ کاروں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ اور ان کی اشاعت

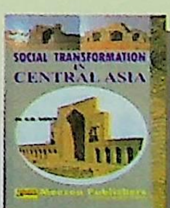
بالعموم اردو اور کشمیری کتابوں کی اشاعت

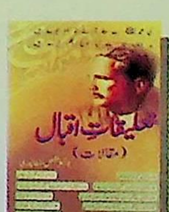
اردو اور کشمیری کے اُبھرتے ہوئے فنکاروں اور قلم کاروں کی حوصلہ افزائی

اور

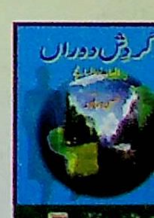
اردو اور کشمیری کی علم وادب کی ترقی اور ترویج











Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services H.Q., Batamaloo, Srinagar, Kashmir-19